

اور اسے بالائی منزل قبرستان سے زیادہ اُداس اور مسلمان دکھائی دی۔ اس نے نوکر کو پکارنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں اُٹک کر رہ گئی۔ بدوہ تیزی سے تدمر اٹھتا ہوا اُٹکے بڑھا اور برآمدے سے غزرنے کے بعد کمرے کے کمرے میں داخل ہوا۔ چند ماہ پہلے وہ بے حس و حرکت کمرے کے درمیان کھڑا رہا۔ اس کی ماں آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ چراغ کی مدھم روشنی میں اس کا رنگ پیدر زرد معلوم ہوتا تھا۔ وہ عورت جس کی صحت پر پڑوس کی نوجوان لڑکیاں رشک کرتی تھیں، اب ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک سن رسیدہ عورت اس کے بستر کے قریب بید کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔

”معظم! مینا تھا اگھر ٹھٹھکے۔ اس کی آپس سسکیاں اور سسکیاں چیخوں میں تبدیلی ہو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ معظم علی! امی جان! امی جان! کتا ہوا اُٹکے بڑھا۔ ماں نے ہاتھ پھیلا دیئے اور اس نے بستر کے قریب دوڑاؤ ہو کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ آہستہ آہستہ علی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلتے جیچیں ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے کہا: میرے بیٹے! میرے لال تم اس طوفان میں آئے ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم مزداد آؤ گے۔ میں صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تمہارے ابا جان کو بھی تمہارا انتظار تھا لیکن تم دُکے اور بوسمت ہم میں سے کسی کا بھی انتظار نہ کر سکا۔“

معظم نے چند سسکیاں لیں اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اُٹکے کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔

”میں نے تمہارا انتظار کیا۔ اور اب اس انتظار کی پوری قیمت ادا ہو رہی ہے۔ امی جان آپ کو بگاڑ رہے۔ میں طبیب کو بلاتا ہوں۔ صابر کہاں ہے؟“

ماں نے کہا: صابر ابھی اٹھ کر گیا ہے۔ کئی دنوں سے نہیں آیا اور طبیب کو بلانے

کی جب کہ موسلا دھار بادش ہو رہی تھی۔ معظم علی اور عبداللہ خان اپنے میں داخل ہوئے۔ عبداللہ خان کا گھر پہلے آتا تھا۔ معظم علی نے اس دروازے پر گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا: عبداللہ اب تم اپنے گھر جا کر راجھی لے جاؤ۔“

معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور وہ اپنے مکان کی طرف رستہ لگی میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد معظم علی نے اپنے مکان کا اندر سے کوئی جواب نہ کیا۔ پھر اس نے صابر کو پکارنے کی کوشش کی۔ حلق میں اُٹک کر رہ گئی۔

بار زیادہ اونچی نہ تھی۔ وہ چند ثانیے توقف کے بعد دیوار پر چڑھا اور صحن میں کود کا صحن کا ایک تھار لگی کی طرح یہاں بھی ایک بالشت پانی جمع ہو چکا۔ اس نے دیوار کے ایک کھلے دروازے سے گزرنے کے بعد بالشتی مکان کے دروازے پر پہنچ کر غصے سے نظر کیا۔ کمرے کا دروازہ نہیں۔ روشن کمرے کی طرف قدم اٹھاتے وقت معظم علی کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ماں! جہاں ہر وقت مسرت کے قہقہے اس کا استقبال کیا کرتے تھے۔ بجلی جیسی

کی ضرورت نہیں۔ حکیم احمد خان ہرنہ میاں آتے ہیں۔ آج شام کے وقت بھی مجھے دیکھ کر گئے ہیں۔ معکم میرے ساتھ دیکھ کر وہ تم یہاں نہیں رہو گے۔ وہ برسوں ہمارے گھر کی تلاش لینے آئے تھے۔ تمہارے آبا اور وصفت کی بندو تیں اور تواریں لے گئے ہیں۔ پڑوسی اب ہمارے گھر کے قریب آنے سے ڈرتے ہیں۔ حسین بیگ کی بیوی اور لڑکی نے میرا بہت خیال دکھا ہے، اگر وہ حمیدہ کو یہاں بھیجتیں تو میں شاید اب تک تمہارا انتظار نہ کر سکتی۔ صابر کے سوا ہمارے سب لوگ غورزدہ ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ میری طرح حسین بیگ بھی بستر پر پڑا ہوا ہے لیکن فرحت صبح شام مجھے دیکھنے کے لیے آتی رہتی ہے۔ بیٹا! ہماری طرح ان کا گھر بھی بڑھ چکا ہے۔

”امی جان میں سب کچھ سن چکا ہوں۔ عبداللہ خاں مجھے راستے میں ملا تھا۔“

ماں نے کہا: یوسف اور افضل پلاسی کے میدان میں دفن ہیں۔ کاش میں موت سے پہلے وہاں جاسکتی۔ حسین بیگ وہاں جانا چاہتا تھا لیکن اسے حکم ہے کہ تم گھر سے باہر نہیں جا سکتے۔ میرے مرنے اس کی جاگیر بھی ضبط کر لی ہے۔ وہ یہاں سے ہجرت کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی ان کے ساتھ ہی چلے جاؤ۔“

”امی جان جب آپ سفر کے قابل ہو جائیں گی تو ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہاں نہیں بٹھریں گے۔“

ماں نے عمر رسیدہ عورت کی طرف دیکھا اور کہا: حمیدہ تم نے بھی دو درویشوں سے آرام نہیں کیا ہے۔ جاؤ ساتھ والے کمرے میں سو جاؤ۔“

حمیدہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی لیکن باہر جھانکنے کے بعد ٹکر بولی: بارش تھم چکی ہے۔ میں گھر جاتی ہوں۔ ضرورت پڑے تو مجھے بلا لیں۔“

حمیدہ کمرے سے نکل گئی اور معظم کی ماں نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا: بیٹا! اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔“

معظم کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے ماں کی نہیں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: امی جان آپ

کا بچا رہبت تیز ہے۔ میں حکیم کو بلاتا ہوں۔“

”نہیں نہیں! ماں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا: تم میرے سامنے بیٹھے رہو۔“

”تو میں صابر کو بھیجتا ہوں۔“

”حکیم دوا دے کر گیا ہے بیٹا! اب وہ اور کیا کرے گا۔ تم میری بات تو سن لو۔“

میں کھولی کے دائیں سرے پر آخری کھونٹے کے بالکل ساتھ تمہاری امانت دفن ہے۔ وہ نکال لیتا۔ وہ تمہارے کام آنے والی چیز ہے۔ میں آج صابر کو بتانے کا ارادہ کر رہی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم آگے۔ جب وہ تلاش لینے آئے تھے تو میں ڈرتی تھی لیکن تمہارے ابا جان کا خیال صبح تھا۔ اگر میں اسے مکان کے اندر چھپانے کی کوشش کرتی تو وہ ضرور تلاش کر لیتے۔ انہوں نے ایک ایک کونے کی تلاش لی تھی۔ شاید انہیں شک تھا کہ سراج الدولہ تمہارے آبا کو کوئی چیز دے گیا ہے۔ ظالم تمہاری لکڑیاں سب لے گئے ہیں۔ مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن حکیم احمد خان نے کہا یہ مر رہی ہے اسے تنگ نہ کرو۔ میرے جھڑپا بیٹا، میرن ان کے ساتھ تھا۔ وہ حسین بیگ کے گھر بھی گئے تھے۔ وہ بستر پر چڑا ہوا تھا۔ فرحت کی ماں نے حیرن کو بڑا ہلا کہا اور اس نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ فرحت آگے بڑھی تو ایک سپاہی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔“

معظم علی غصے کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آگ کے انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔

ماں نے کہا: بیٹا! اب اس ملک میں عورت اور شرافت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مرشد آباد پر خدا کا ترنازل ہو چکا ہے۔ حسین بیگ کو علی وردی خاں کے وزیر سلام کرتے تھے افضل اور آصف، سراج الدولہ کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور آج میرے جیسے ذلیل انسان کے ہاتھوں ان کی ماں اور بہن کی عزت محفوظ نہیں۔“

معظم علی کا نپتے ہوئے ہونٹوں سے کرب انگیز آواز نکلی: امی جان میں اس سے

نیا وہ نہیں سن سکتا۔ میں فن سے ان تمام مظالم کا بدلہ لوں گا۔
 "میں معظّم تم میرے ساتھ وعدہ کر دو کہ تم یہاں نہیں رہو گے۔ تمہارے باپ کو اتنے
 وقت یہی خوف تھا کہ تم جوش میں آ کر اپنی جان پر کھیل جاؤ گے اور پھر دنیا میں ہمارا
 نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میرے بعد یہاں سے کہیں دور چلے جانا اور وہ امانت ضرور
 نکال لینا، تمہارے کام کئے گی اور شاید تم اس سے حسین بیگ کی بھی مدد کر سکو۔ وہ
 میرے بہت قیمتی ہیں اور میں نے اپنے زور اور چند اشرافیاں بھی ان کے ساتھ دفن کر
 دی ہیں لیکن کسی کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے!!"

معظّم علی نے پوچھا: وہ میرے کہاں سے آئے؟

• بیٹا تمہارے آبا جیان زخمی ہو کر سراج الدولہ کے ساتھ مرشد آباد پہنچے تھے۔ محل
 کے ایک پیر ملیر نے مجھے اطلاع دی۔ میں وہاں پہنچا، ان کی حالت بہت خراب تھی۔
 سراج الدولہ اور شاہی طبیب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہی طبیب نے مجھے
 بتایا کہ زخم بہت خطرناک ہیں اور اس حالت میں سفر کی وجہ سے ان کا بہت سا خون
 ضائع ہو چکا ہے۔ سراج الدولہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہتا تھا کہ میں نے انہیں
 منع کیا تھا لیکن یہ کسی حالت میں بھی میرا ساتھ چھوٹنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ یوسف
 کی لاش کو بھی سپردِ دعا کہہ کر کہے۔ میں شام تک وہیں رہی لیکن ان کی حالت خراب
 ہوتی گئی۔ رات کے وقت جب سراج الدولہ نے مرشد آباد چھوڑنے کا ارادہ کیا تو انہوں
 نے سپردِ یادوں کو حکم دیا کہ انہیں گھر پہنچا دیا جائے اور جب وہ ان کی چارپائی اٹھانے لگے
 تو سراج الدولہ کی ماں نے اپنا ہار اتار کر میرے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے انکا
 رد کیا۔ اس نے کہا: میری بہن یہ انعام نہیں خراج ہے۔ میرے نزدیک دنیا کے تمام خزانے
 بھی محمد علی خاں کی وفاداری کا صلہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں نے اس کا تختہ قبول نہ کیا۔ جب ہم
 محل سے نکلے تو خواجہ سرہما سے ساتھ تھا۔ سپاہی تمہارے آبا جیان کو گھر چھوڑ کر چلے گئے لیکن

خواجہ سرہما رک گیا اور اس نے مجھے ایک چھوٹی سی قبیلہ پیش کرتے ہوئے کہا: یہ نواب صاحب
 نے بھیجی ہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ قبیلہ میرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔
 تمہارے آبا جیان راستے میں بیہوش ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں ہوش آیا
 تو انہوں نے اصرار کیا کہ میں وہ قبیلہ جس میں بیش قیمت میرے تھے اپنے پاس رکھنے کی
 بجائے صطبل میں دفن کر دوں گا۔ اس وقت میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہ
 تھی۔ میں نے وہ قبیلہ تمہاری کتابوں کی الماری میں رکھ دی۔ اچھی رات کے قریب وہ چل
 بسے۔ آخری وقت وہ مجھے بار بار یہ تاکید کرتے تھے کہ ہم یہاں سے فوراً ہجرت کر جائیں۔ انہیں
 ڈر تھا کہ تم یہاں رہ کر کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔ صبح کے وقت حکیم احمد خاں، مرزا حسین بیگ
 اور پڑوس کے چند عزیز لوگوں کے سوا ان کے جنازے میں کوئی نہ تھا۔ حسین بیگ کی
 طبیعت بہت خراب تھی، حکیم احمد خاں نے انہیں روکا لیکن وہ جنازے میں شامل ہونے
 پر بضد تھے۔ اگلے دن مجھے پتہ چلا کہ ان کے گھر کی تماشائی لی گئی ہے اور میں نے تمہارے
 لیے ان میروں کی حفاظت کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ رات کے وقت میں نے انہیں
 دفن کر دیا۔ ان کے ساتھ میرے زیورات بھی دفن ہیں۔ آج شام میں سوچ رہی تھی کہ اگر تم
 نہ آئے تو میں صابر کو بتا دوں گی لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ میرے دل سے ایک بوجھ
 اتر چکا ہے۔ جب تم کھڑی کے بائیں سرے پر آخری کھونٹے کے ساتھ زمیں کھود گے تو تمہیں
 ایک صندوقچی ملے گی۔ صندوقچی کے اندر ایک چڑھے کی قبیلہ ہے جس میں وہ میرے اور
 میرے زیورات ہیں۔"

معظّم خاموش تھا۔ اسے جواہرات اور اشرافیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تصور میں کہیں
 اپنے بھائی کو میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرتا اور کہیں اپنے باپ کو نزع کے عالم میں دیکھ
 رہا تھا۔ کہیں وہ افضل کے متعلق سوچتا اور زندگی کی ہر شے اسے بے حقیقت اور بے معنی
 نظر آنے لگتی۔

ماں نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کر لیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: میرے لعل
میرے بیٹے کو دشمن سے بچانا۔ اب تیرے سوا کوئی سہارا نہیں۔ آہستہ آہستہ معظّم کے
ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی۔

امی جان! امی جان! معظّم علی نے گہرا کر کہا۔

ماں نے آنکھیں کھولیں اور نکلی بانڈھ کر معظّم علی کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ
اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔

امی جان! معظّم علی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

ماں کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ پھر اس نے ایک کپکپی کے بعد دو تین گہرے سانس
لیے اور اس کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسو تکیے پر گر پڑے۔

امی! امی! معظّم علی اسے بازو سے پکڑ کر تجھوڑ رہا تھا لیکن وہ اپنی زندگی کا سفر ختم
کر چکی تھی۔

معظّم علی دیر تک سکے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ وہ چلانا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق
میں آواز نہ تھی۔ وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن اس میں جلنے کی سکت نہ تھی۔ اسے یقین
نہیں آتا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ آمنہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور معظّم علی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ابھی
تک اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک خواب ہے۔ "امی! امی! وہ
اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی بغضیں ٹٹول رہا تھا۔ اسے گری نیند سے بیدار کرنے
کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔



پچھلے پھر چارے نمٹا رہا تھا لیکن اس نے اٹھ کر تین ڈالنے یا نوکر کو آواز دینے کی ضرورت
محسوس نہ کی۔ اس کے دل میں کسی کو دیکھنے یا کسی کے ساتھ بات کرنے کی خواہش نہ تھی۔
ماضی اور حال کے واقعات کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آرہی تھیں

ماں نے کہا: "بیٹا تمہاری غیر حاضری میں فرحت تمہارے متعلق پوچھا کرتی تھی۔ وہ
کتنی شوخ تھی لیکن اب اس کے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔ حسین بیگ کی بیماری کے
باد و ہر روز میرے پاس آتی رہی ہے۔ اس کی ماں نے بھی میرا بہت خیال رکھا ہے۔
اس نے حمیدہ کو میرے پاس بھیج دیا تھا۔ میں سمجھا کرتی تھی کہ وہ مغزور ہیں لیکن انھوں نے مجھ
پر بہت احسان کیا ہے۔ کاش تم اس احسان کا بدلہ دے سکو۔ بیٹا مجھے اپنے باپ کے
پاس دفن کرنا!"

معظّم نے کہا: "نہیں امی جان آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

ماں مسکرائی، لیکن اس کی مسکراہٹ اس کے آنسوؤں اور آہوں سے زیادہ کرب انگیز
تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا: "بیٹا یوسف جیسے بیٹے کی موت کے بعد کوئی
ماں اور تمہارے آبا جیسے شوہر کی موت کے بعد کوئی بیوی زندہ نہیں رہ سکتی۔ بیٹا سچ کہو،
تمہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟ تم تو یہاں سے بہت دور تھے۔ میرے جعفر کو تمہارے ساتھ کیا دشمنی
ہو سکتی ہے!"

معظّم علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "امی جان مجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

ماں نے دونوں ہاتھ بڑھا کر معظّم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: "بیٹا میں خدا سے دعا کرتی تھی
کہ موت سے پہلے صرف ایک لمحہ کے لیے تمہیں دیکھ لوں۔ پھر میں غمش سے جان دے دوں
گی۔ لیکن اب تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر میں کچھ دیر اور زندہ رہنا چاہتی ہوں۔
کم از کم اس وقت تک جب تک کہ مجھے یہ یقین نہیں ہو جاتا ہے کہ تمہیں ان دردوں سے کوئی
خطرہ نہیں۔ بیٹا اگر تمہیں کوئی خطرہ ہے تو خدا کے لیے یہاں نہ ٹھہرو!"

معظّم علی نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "امی جان میری
رگوں میں میرے غم و رباپ کا خون ہے۔ اگر مر شہ آباد بھیڑیوں سے بھر جائے تو بھی میں
آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

زیادہ خراب ہو تو ہمیں اطلاع دینا۔ میں نے صابر سے بھی کہا تھا۔
معظم علی نے جواب دیا۔ ”وہ رات کے وقت اپنے گھر چلی گئی تھی اسے امی جان
نے بھیجا تھا۔“

”آپ کب آئے تھے؟“

”میں آدھی رات کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ اس وقت امی جان کی حالت زیادہ
تشویش ناک نہیں تھی۔ وہ دیر تک میرے ساتھ باتیں کرتی رہیں لیکن پھر چلے گئیں۔
اب بھی ان کی موت کا یقین نہیں آتا لیکن اب دنیا بدل چکی ہے۔ چند دنوں کے
اندرازدہ رکتی ناقابل یقین باتیں ہو چکی ہیں۔ یوسف اور افضل کی موت پر کسے یقین آسکتا
ہے۔ فرحت کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ افضل اور یوسف مجھے کتنے عزیز تھے اور ان کی
موت کے میرے لیے کیا معنی ہیں؟“

”مجھے معلوم ہے۔“

”تمہارے آبا جان اب کیسے ہیں؟“

”شام کے وقت ان کی طبیعت بہت خراب تھی لیکن آدھی رات کے قریب نہیں
نیز آگئی تھی اور اب ان کی حالت کچھ بہتر ہے۔ نماز کے وقت مجھے امی جان نے کہا تھا
کہیں چچی جان کا پتہ کروں۔ اب میں جاتی ہوں۔ وہ انتظار کر رہی ہوں گی۔
معظم علی نے کہا۔ ”فرحت امی جان تمہاری بہت احسان مند تھیں اور میں بھی
میشہ تمہارا ممنون رہوں گا۔“

”لیکن مجھے ہمیشہ اس بات کا ملال رہے گا کہ میں آخری وقت ان کے پاس نہ
تھی۔ یہ کہہ کر فرحت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی لیکن
دہیز سے باہر پاؤں رکھتے ہوئے وہ رکی اور مڑ کر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
”ابا جان کہتے تھے کہ آپ کا یہاں آنا خطرناک ہے۔ وہ ہر اچھے آدمی کو گرفتار کر

وہ نیم خرابی کی حالت میں اپنے والدین، اپنے بھائی اور اپنے دوستوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہی
وہ محراب کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا اور کبھی فرج کے جواؤں کے ساتھ ٹنن
پر گری کی مشق کر رہا تھا۔ پھر جب وہ مانی کے سپنوں کی دنیا سے نکل کر حال کی تکلیف کا سامنا
کرتا تو اس کا دل نفرت اور حقارت سے بھر جاتا۔ صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے اور وہ نیم خرابی
کی حالت میں آنکھیں بند کیے کبھی دکلش اور کبھی بھینانک پسینے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے اپنے
سر پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا اور اس کے کانوں میں ہلکی سی سسکیوں کی آواز آنے
لگی تاہم وہ بدستور آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ہاتھ کی انگلیاں اس کی پیشانی
کو چھونے لگیں۔ پھر کسی نے نجیف اور سہبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”معظم! معظم!“
معظم نے مڑ کر دیکھا اور اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک نوجوان لڑکی گھبرا کر
ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”کون! فرحت؟“

فرحت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس نے جواب دینے کی بجائے سر
جھکا دیا۔

معظم علی نے کہا۔ ”امی جان اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔“

فرحت نے اپنی اذہنی کے ساتھ آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے۔ میں
انہیں دیکھ چکی ہوں۔ میں کافی دیر سے یہاں کھڑی تھی۔ آپ شاید سو رہے تھے۔ میں ڈر گئی
تھی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

معظم علی نے فرحت کی طرف دیکھا اور اسے اس نظم، بخار و ریا کی تاریک دنیا میں
ایک روشنی دکھائی دینے لگی۔ اس نے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر
کہا۔ ”فرحت میں بہت سخت جان ہوں۔“

فرحت نے کہا۔ ”حمیدہ کہاں گئی؟“ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ اگر ان کی طبیعت

رہے ہیں۔

معظم علی نے کہا۔ ”آپ فکر کریں۔ اب میرے لیے کوئی بات خطرناک نہیں ہو سکتی۔“
 ”لیکن آپ کو احتیاط ضرور کرنی چاہیے!“
 ”مجھے یقین ہے کہ افضل کی بہن مجھے خطرے سے بھاگنے کا مشورہ نہیں دے گی۔“
 ”نہیں، میں آپ کو بیڑیوں کا مقابلہ کرنے سے منع نہیں کرتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں
 کہ آپ ان کے زرخے میں آنے کی کوشش نہ کریں۔“
 ”اب سارا بنگال بیڑیوں کے زرخے میں اچکا ہے۔“
 فرحت کچھ اور کسے بغیر باہر نکل گئی۔

ایک ستارہ جسے اس نے ہمیشہ آسمان کی بلندیوں پر دیکھا تھا اس کے ظلمت کدہ
 میں نور کی کرنیں بکھیرنے کے بعد روپوش ہو چکا تھا۔ معظم علی کچھ دیر دروازے میں کھڑا صحن
 کی طرف دیکھتا رہا۔ فرحت، مرزا حسین بیگ کی بیٹی، آصف اور افضل کی بہن اس کے گھر
 آئی تھی۔ وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کر چکا تھا۔ لیکن ساز حیات کے وہاں
 جو کبھی اس کے تصور سے لرزا اٹھتے تھے۔ اب خاموش تھے۔ آرزوؤں، انگوں اور دلوں کا
 وہ صنم کدہ جسے اس نے فرحت کی خیالی تصویروں سے آباد کیا تھا دیران ہو چکا تھا۔



برآمدے کے دوسرے کونے میں صابر اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ معظم علی
 نے آگے بڑھ کر اسے جگایا۔ صابر بوجھ کی حالت میں اٹھا اور بے اختیار معظم علی سے
 پست گیا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی اس کی
 سسکیاں جیوں میں تبدیل ہو رہی تھیں اور پھر جب اس نے سنبھل کر اپنی تباہی کی داستان
 سنانے کی کوشش کی تو معظم علی نے کہا:
 ”صابر مجھے سب معلوم ہے۔“

صابر نے کہا۔ ”آپ کی امی جان بیمار ہیں۔ چلیے وہ اس کمرے میں ہیں۔“
 معظم علی نے کہا۔ ”وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔“

صابر چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا معظم علی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بھاگتا
 ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا باہر نکل آیا۔
 تھوڑی دیر بعد محلے کی عورتیں وہاں جمع ہو رہی تھیں اور معظم علی دیوان خانے کے
 برآمدے میں محلے کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ حسین بیگ لاشی ٹیکتا ہوا مکان
 کے اندر داخل ہوا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا اور کزوری کے باعث اس کی ٹانگیں
 لڑکھارہی تھیں۔ افضل اور فرحت کے باپ کی یہ حالت معظم علی کے لیے ناقابل برداشت
 تھی۔ وہ بے اختیار اٹھ کر آگے بڑھا اور حسین بیگ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے سینے سے
 لگا لیا۔

معظم علی نے کہا۔ ”چچا جان آپ کو بخار ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا!“
 حسین بیگ نے جواب دیا۔ ”بیٹا! اب مجھے قبر میں ہی آرام مل سکتا ہے۔“ حسین بیگ
 کچھ دیر برآمدے کے فرش پر معظم علی کے پاس بیٹھا رہا لیکن محلے کے لوگوں نے اسے مجبور
 کر کے کمرے کے اندر بستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر بعد جب معظم علی کی والدہ کا جنازہ اٹھایا جا رہا
 تھا، حسین بیگ کمرے سے باہر نکل آیا لیکن معظم علی نے کہا۔ ”چچا جان! اس حالت میں
 آپ کو جنازے کے ساتھ نہیں جانا چاہیے۔ آپ گھر جا کر آرام کریں۔“
 محلے کے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر حسین بیگ کو سہارا دیا اور وہ بادل خواستہ اپنے
 اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اپنی والدہ کو سپرد خاک کرنے کے بعد معظم علی اپنے گھر جانے کی بجائے مرزا حسین بیگ
 کی حویلی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ نجی منزل کے ایک کمرے میں لیٹے ہوئے تھے،
 فرحت اور اس کی والدہ ان کے بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ خادمہ نے معظم علی

مترشح تھی۔ وہ مرزا حسین بیگ اور معظم علی کو دیکھ کر آگے بڑھا اور برآمدے کی میز صیوں کے قریب پہنچ کر بولا۔ "تمہارا نام معظم علی ہے؟"

معظم علی کی خاموشی پر مرزا حسین بیگ نے جواب دیا۔ "ہاں ان کا نام معظم علی ہے۔ میر مرین نے حذارت سے حسین بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بڑھے تم خاموش رہو!"

معظم علی نے محسوس کیا کہ اس کے دل پر انگارہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

میر مرین نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ "بدلتی ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم مرشد آباد کیوں آئے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "مرشد آباد میرا گھر ہے۔"

میر مرین نے بوجھا۔ "کیا میدان پور کے فوجدار نے تمہیں وہاں حاضر ہونے کا حکم نہیں بھیجا تھا؟"

میرزا پور کے فوجدار نے مجھے وہاں بلایا تھا لیکن اس نے مجھے پلاسی کی جنگ کے حالات نہیں بتائے تھے۔"

"اور اب تمہیں پلاسی کی جنگ کے حالات معلوم ہو چکے ہیں۔"

ہاں۔"

میر مرین نے کہا۔ "ہم تم سے وفاداری کا حلف لینے آئے ہیں۔"

"وفاداری کا حلف! میرے جگر کے لیے؟" معظم علی نے تن کر کہا۔

میر مرین نے اپنے جوتے کٹتے ہوئے کہا۔ "جو وقت تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم کسی اور کے

لئے وفاداری کا حلف لینے آئے ہیں؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "وفاداری کا حلف سنگینوں کے پہرے میں نہیں لیا جاتا۔ میں

کی آمد کی اطلاع دی۔ فرحت اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ معظم علی کمرے میں داخل ہوا تو فرحت کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ معظم علی، حسین بیگ کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ حسین بیگ نے قہر سے توقف کے بعد کہا۔ "معظم علی! ہمیں ایک دوسرے کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم پر کیا گزری ہے۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تم کو جان ہوا اور تمہاری بہت ہمارا آخری سہارا ہے۔ تم بہت تھکے ہوئے ہو اور تھکا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نے کئی دن سے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ میں تمہارے گھر کھانا بھیج رہا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہیں بیٹھ کر کچھ کھاؤ۔"

"چچا جان مجھے بھوک نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری خاطر چند نوالے کھاؤ۔" پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ "عابدہ! خادمہ سے کو ان کے لیے کھانا لے آئے۔"

"میں خود لاتی ہوں۔" حسین بیگ کی بیوی یہ کہہ کر آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد عابدہ نے کھانا لا کر معظم علی کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ معظم علی نے حسین بیگ کے دوبارہ اصرار کرنے پر بادل نہ خواستہ ایک تھرا اٹھا کر مزہ میں ڈالا تھا کہ اچانک ایک نوکر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "میر مرین آیا ہے اور اس کے ساتھ مسلح سپاہی ہیں۔"

میر مرین، میر جعفر کا بیٹا تھا اور مرزا حسین بیگ اور معظم علی کے لیے اس کی آمد کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مرزا حسین بیگ بستر سے اٹھا اور اپنی لاشی پکڑ کر لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ معظم علی نے جلدی سے اٹھ کر ایک بازو پکڑ لیا۔ وہ دیا نمانے کے برآمدے میں داخل ہوئے۔ نیچے صحن میں میر مرین بیس مسلح سپاہیوں کے ساتھ دکھائی دیا۔ میر مرین اپنی عمر کے لحاظ سے کافی موٹا تھا۔ اس کے چہرے سے غرور، عیاری، بے حیائی اور سفاکی

نے دونوں ہاتھوں سے کورے کا ایک سر اچھڑایا۔ دو سپاہیوں نے فرحت کو پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ان کی گرفت میں بے بس ہو کر چلا رہی تھی۔ تم کہنے ہو، تم بزدل ہو! ایک آدمی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور تم یہ سمجھتے ہو کہ تم شیر بن گئے ہو۔ میر میر نے پے درپے معظم علی کو چند اور کورے لگائے اور جب اس نے بیہوش ہو کر گر دن ڈھیلی چھوڑ دی تو اس نے سپاہیوں سے کہا: اسے قید خانے لے چلو۔ پھر وہ آگے بڑھ کر حسین بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ تم بڑھے ہو اور آج کل نے مجھے حکم دیا تھا کہ تم پر سختی نہ کی جائے لیکن اب ہمارے دشمنوں کے لیے بنگال میں کوئی جگہ نہیں ہیں تمہیں سکھ دیتا ہوں کہ تم ایک ہفتہ کے اندر اندر بنگال کی حدود سے نکل جاؤ۔

معظم علی کو ہوش آیا تو وہ ایک تنگ دھاری کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا۔ دس سپاہی اس کے سر پر کھڑے تھے اور ایک تیسرا پانی کی بالٹی سے کپڑا جھگو جھگو کر اس کے زخموں پر ڈال رہا تھا۔ معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پانی مانگا۔ ایک سپاہی نے کوٹھڑی کے کونے میں مٹی کے گھرے سے پانی کا ایک پیالہ بھر کر اسے دیا۔ معظم علی نے پانی پینے کے بعد سپاہیوں کی طرف دیکھا اور سوال کیا: میں کہاں ہوں؟ ایک سپاہی نے جواب دیا: تم مرشد آباد کے قید خانے میں ہو۔

معظم علی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی جا چکے تھے اور کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ انتہائی کرب کی حالت میں منہ کے بل فرش پر لیٹ گیا۔

قید و بند کی صعوبتیں اس کے لیے نئی نہ تھیں۔ وہ اس سے پہلے بھی قیدہ چکا تھا لیکن اس کا المناک پہلو یہ تھا کہ اسے اس سلطنت کا باغی قرار دیا جا چکا تھا جس کی آزادی کے لیے اس کا باپ، اس کا بھائی اور اس کے دوست شہید ہو چکے تھے۔

یہ ملنے سے انکار کیا ہوں کہ میر جعفر بنگال کا حکمران ہے:

”سپاہیو! میر میرن پدی قوت سے چلایا۔ تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اسے گرفتار کرو!“
”شہر و! حسین بیگ نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دو تین قدم آگے بڑھ کر میر میرن سے مخاطب ہوا۔ ”میر میرن خدا سے ڈرو۔ معظم علی کا باپ اور بھائی اپنے خون سے تمہارے باپ کی غداری کی قیمت ادا کر چکے ہیں۔“
میر میرن نے انتہائی غضب کی حالت میں آگے بڑھ کر حسین بیگ کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ برآمدے کی میز صیوں پر گر پڑا۔

ان کی آن میں معظم علی نے یکے بعد دیگرے میر میرن کے منہ پر دو گھونے رسید کیے میر میرن تورا کر پیٹھ کے بل گر پڑا۔

سپاہیوں نے تواریں سونت لیں لیکن میر میرن چلایا۔ خبردار! میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔

چند سپاہی تواریں پھینک کر معظم علی پر ٹوٹ پڑے لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میر میرن کے حکم سے معظم علی کو صحن کے ایک درخت کے ساتھ بانڈ دیا گیا۔ میر میرن نے اس کی قمیص درج کر پھینک دی اور ایک سپاہی کے ہاتھ سے کورالے کر کہا: تمہارے جیسے باغیوں کی مزاحمت نہیں۔ تمہاری مزا یہ ہے! کہو اب وفاداری کا حلف اٹھاتے ہو یا نہیں؟“

جب معظم علی پر کورے برساتے جا رہے تھے تو مرزا حسین بیگ نے اٹھ کر مداحات کی کوشش کی۔ لیکن ایک سپاہی نے اپنی توار کی نوک اس کے سینے پر دکھ کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اچانک فرحت کمرے سے نکلی اور بھاگ کر معظم علی اور میر میرن کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ میر میرن نے کورالے کیا تو وہ آگے بڑھ کر معظم علی کے لیے ڈھال بن گئی۔ میر میرن نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی تو اس

دن بعد اس کی کوٹھڑی میں تین اور قیدی دھکیل دیئے گئے۔ یہ تینوں بنگال کی فوج کے بڑے بڑے افسر تھے اور ان کی زبانی معظم علی نے ان سے حسین بیگ کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی گرفتاری کے دوسرے روز مرشد آباد سے ہجرت کر گئے تھے اور حکومت نے ان کی جائز ضبط کر لی ہے۔ ایک افسر نے معظم علی کو بتایا کہ ان کے ساتھ تیس اور آدمی گرفتار ہوئے ہیں اور ابھی مزید گرفتاریوں کی توقع ہے۔ گذشتہ چند دنوں میں مرشد آباد کا قید خانہ بھر چکا ہے اور اب قیدیوں کو دوسرے شہروں میں بھیجنے کی تجویز پر غور ہو رہا ہے۔ قید ہونے والوں میں صرف حکومت کے باغی ہی نہیں بلکہ وہ متول لوگ بھی ہیں جن کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ میر جعفر کو بڑی بڑی رقعات پیش نہیں کر سکے۔ میر جعفر اپنے انگریز سرپرستوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں مرشد آباد کا خزانہ ان کے حوالے کر چکا ہے اور اب لارڈ کلایو کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورا کرنے کے لیے اس نے بنگال کے امارات کو بے تحاشا لوٹنا شروع کر دیا ہے۔ بڑے بڑے زمیندار اور باجروں کو کوڑی کے محتاج ہو کر بنگال سے ہجرت کر رہے ہیں۔

○
معظم علی کو مرشد آباد کے قید خانے میں اڑھائی بجے گزر گئے۔ ایک دن قید خانے کا دروازہ چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوا اور اس نے کہا: معظم علی آج تمہارا مقدمہ عدالت کے سامنے پیش ہوگا۔

معظم علی تنگی تواریں کے پہرے میں اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلا اور دارالفر کے ساتھ چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ قید خانے کے ایک کسادہ کمرے میں کھڑا تھا اور اس کے سامنے عدالت کی کرسی پر میر جعفر کے خاندان کا ایک فوجی افسر، میر ناصر، رونق افروز تھا۔ اس کے دائیں بائیں چار اور فوجی افسر بیٹھے تھے۔ میر ناصر، اڑیسہ کی بعض زبانوں میں معظم علی کے ساتھ رہ

چکا تھا۔ اس نے معظم علی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے سامنے میز سے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھنے کے بعد کہا: معظم علی تمہارے خلاف پہلا الزام یہ ہے کہ تم میدان پور کے فوجدار کا حکم ملے پر دہاں حاضر ہونے کی بجائے مرشد آباد آ گئے تھے۔ تمہارے خلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ تم نے لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا اور تمہارے خلاف تیسرا الزام یہ ہے کہ تم نے گرفتاری کے وقت میر میرن پر حملہ کیا تھا۔ یہ تینوں الزامات بے حد سنگین ہیں۔ تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟

معظم علی نے پہلے اپنے دائیں بائیں اور پھر ان پہرہ داروں کی طرف دیکھا جو بیچ تواریں لیے کھڑے تھے اور پھر کرسی عدالت کی طرف متوجہ ہو کر کہا: میں جانتا ہوں کہ اس عدالت میں آپ مجھ سے زیادہ بے لمس ہیں۔ اس لیے میں صفائی پیش کر کے آپ کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ سنا ہی چاہتے ہیں تو میر جواب یہ ہے کہ مجھے سرحدی قلعے سے میدان پور روانہ ہوتے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے جس حکومت کی خدمت کا بڑا اٹھایا تھا وہ ختم ہو چکی ہے اور اب میدان پور کا فوجدار یا تو مرشد آباد کے حالات سے بے خبر ہے یا وہ ایک ایسی حکومت کا نمائندہ ہے جس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد مرشد آباد میں ایسے لوگ مجھ سے وفاداری کا حلف لینا چاہتے تھے جن کے ہاتھ بنگال کے حریت پسندوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ مجھ پر تیسرا الزام یہ ہے کہ میں نے میرن پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ میرن میرے نزدیک بنگال کے جائز حکمران کا بیٹا نہیں تھا بلکہ ایک ایسا بد زبان اور بد اخلاق آدمی تھا جس نے میری قوم کے ایک ایسے بزرگ پر ہاتھ اٹھایا تھا جس کے نوجوان بیٹے بنگال کی آزادی کے لیے اپنا خون پیش کر چکے ہیں۔ میرا اصلی جرم یہ ہے کہ میں نے بنگال میں جہنم لیا اور پھر ایک سپاہی کی حیثیت میں اس قوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا، جس کے امارات سے چند محلوں میں فروخت کرنے کے لیے تیار تھے۔

دسوال باب

ایک رات اچانک معظم علی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک سپاہی نے جس کے ہاتھ میں مشعل تھی، اندر جھانکتے ہوئے کہا: "آپ باہر آئیں!"

معظم علی باہر نکلا تو چار مسلح سپاہیوں کے علاوہ قید خانے کا داروغہ اور میر ناصر دہلوی کے سامنے کھڑے تھے۔ میر ناصر نے کہا: "معظم علی میں تمہیں کسی اور جگہ لے جانا چاہتا ہوں اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم جھگڑنے کی کوشش نہیں کرو گے تو تمہیں بڑیاں پہننے کی تکلیف نہ دی جائے۔"

معظم علی نے سوال کیا: "آپ کو میرے وعدے پر اعتبار آجائے گا؟"

"ہاں" میر ناصر نے جواب دیا۔

"آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟"

میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔"

معظم علی نے داروغہ کی طرف دیکھا اور کہا: "میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بے بس ہیں۔ لیکن اگر قید خانے سے باہر میری مرین میرا انتظار کر رہا ہے تو آپ کو کسی جھجک کے بغیر یہ بات کہہ دینی چاہیے۔"

داروغہ کی بجائے ناصر نے کہا: "میں آپ کو صرف اتنا بتا دیتا چاہتا ہوں کہ میں نیک ارادے سے یہاں آیا ہوں۔"

میر ناصر نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ تم زندگی سے بہت تنگ آچکے ہو۔ یہ جگہ ایسی قزموں کے لیے موزوں نہیں۔ تم اپنی صفائی میں کچھ کرنا چاہتے تو ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔" میں ایک ایسی عدالت کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا انسانیت کی توہین سمجھتا ہوں جو مجھ سے زیادہ بے بس ہے۔ میر جعفر کو اس تکلف کی مزدورت نہ تھی۔ میں آپ کی زبان سے اپنے متعلق ان کا حکم سننے کے لیے تیار ہوں۔"

میر ناصر کچھ دیر گھوم بھٹکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر چند سطور لکھنے کے بعد معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "تمہارے جرائم نہایت سنگین ہیں لیکن تمہارا خاندان کی گزشتہ خدمات کے پیش نظر تم کو سات سال قید کی سزا دی جاتی ہے۔"

لم علی نے ایک کرب اگیز مسکراہٹ کے ساتھ میر ناصر کی طرف دیکھا اور میر ناصر نے اپنی گردن جھکالی۔

معظم علی نے مرکز قید خانے کے داروغہ کی طرف دیکھا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ داروغہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور اس نے منہ پھیرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا: "اے لے چلا!"

رات کے وقت جب قید خانے کی کوٹھڑی میں معظم علی کے ساتھی گہری نیند سو رہے تھے وہ سرسجی ہو کر انتہائی اگسار کے ساتھ یہ دعا مانگ رہا تھا: "میرے مولیٰ مجھے ہمت دے کہ میں اس آزمائش میں پورا اتر سکوں۔"

اتھ بیٹھے اور گزرتے۔ اس عرصہ میں معظم علی کے ساتھی کسی اور جگہ منتقل ہو چکے تھے اور ہر وقت وہ قید خانے سے فرار ہونے کی تدبیریں سوچا کرتا تھا۔

ہوئے۔ دیوان خانے کے قریب ایک روشن کمرے کے سامنے سپنج کر سپاہی رک گئے اور میرزا ناصر معظم علی کرے میں داخل ہوئے۔ میر قاسم ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میر ناصر نے کہا: "یہ معظم علی ہے!"

میر قاسم نے معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "بیٹھ جاؤ!" معظم علی کو کرسی پر بیٹھتے ہوئے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ ایک قیدی کا بوسیدہ لباس پہنے ہوئے ہے۔ میر قاسم کچھ دیر بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالاخر اس نے کہا: "معلم علی میں تمہارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں اور میں نے قید خانہ کے دادرغہ کو ہدایت کی تھی کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ دی جائے، مجھے افسوس ہے کہ جو لوگ سونے میں تو لے جانے کے قابل تھے وہ قید خانے میں سڑ رہے ہیں۔ بنگال کو مزید تباہی سے بچانے کی اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ اسے میر جعفر کی حکومت سے نجات دلائی جائے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس تباہی کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن ہم غلط فہمی اور غلط اندیشی میں مبتلا تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ میر جعفر حکومت کی گدی پر بیٹھنے کے بعد ایک اچھا حکمران ثابت ہوگا لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی حکومت بنگال کے لیے ایک لعنت ہے۔ وہ ایک کوٹھو ہے جس سے انگریز بنگال کے عوام کو خون چھڑنے کا کام لے رہے ہیں۔ اس نے بنگال کے بہترین اضلاع انگریزوں کے حوالے کر دیئے ہیں۔ بنگال کے امراء کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر یہاں سے ہجرت کر رہے ہیں۔ میں نے فوج کے عجب وطن فوجیوں سے بات چیت کی ہے۔ وہ میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے میرا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور میرے ساتھ تعاون کے لیے ان کی پہلی شرط یہ ہے کہ میں تم جیسے لوگوں کو قید سے راکھوں کی کوشش کروں۔"

معلم علی نے چند ثانیے سوچنے کے بعد کہا: "میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پہلے آپ کو انگریز کے ساتھ لڑنا پڑے گا اور انگریز کے ساتھ لڑنے کے لیے فوج کے

معلم علی نے کہا: "موجودہ حالات میں اگر اس ملک میں نیکی کا تصور باقی رہ گیا ہے تو یہ ایک معجزہ ہے۔ بھال میں اس مجبوری کی حالت میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھانگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ چلیے!"

معلم علی، میر ناصر کے ساتھ قید خانے کے چھانک سے باہر نکلا تو دو سپاہی ہندوستان اٹھائے سامنے کھڑے تھے اس نے جواب طلب نگاہوں سے میر ناصر کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا: "آپ گھبراہٹ میں نہیں۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کے دماغ پر متنبی ہے لیکن اگر آپ غلطی کر نہیں تو آپ کی جگہ میں عمر بھر کی تید کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں یہ آدمی ہمارے پیچھے آئیں گے اور آپ کی اطلاع کے لیے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں بہترین نشانہ باز ہیں۔" معظم علی نے میر ناصر کے ساتھ چلنے کے بعد اچانک سوال کیا: "میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ انہیں یہاں سے کتنی دور نشانہ بازی کا حکم دیا جائے گا؟"

میر ناصر نے جواب دیا: "معلم علی گھبراؤ نہیں۔ تمہیں میر قاسم نے بتایا ہے۔"

میر قاسم کون، میر جعفر کا داماد؟

ہاں۔ میں اکثر ان سے تمہارا ذکر کیا کرتا تھا۔ آج انہوں نے تم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر تم عقلندی کا ثبوت دو تو مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کے نتائج تمہارے حق میں بڑے نہیں ہوں گے۔"

معلم علی نے کہا: "اگر میر قاسم یہ سمجھتا ہے کہ قید میں رہ کر میر جعفر کی حکومت کے متعلق میرے خیالات بدل گئے ہیں تو اسے ایسی ہی ہوگی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ مجھے یہیں سے واپس لے چلیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ میر قاسم کو تمہارے استقلال نے متاثر کیا ہو اور بنگال اور میر جعفر کے متعلق

اب اس کے خیالات بھی وہی ہوں جو تمہارے ہیں۔"

قریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد معظم علی اور میر ناصر قاسم کے عالی شان مکان میں داخل

میر قاسم نے مایوس ہو کر کہا: "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تمام عمر قید خانہ میں رہنا پسند کرتے ہو؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں چھوٹے قید خانے سے نکل کر بڑے قید خانے میں نہیں آنا چاہتا۔"

میر قاسم نے کچھ سوچ کر کہا: "فرض کرو اگر میں اپنی ذمہ داری پر تمہیں قید سے آزاد کروں تو تم کیا کرو گے؟"

"میں موقع ملے ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ اب مجھے بنگال کی آب و ہوا اس نہیں آئے گی۔"

میر قاسم نے کرسی سے اٹھ کر کچھ دیر کمرے میں بیٹھنے کے بعد کہا: "اگر اب تمہیں واپس قید خانے میں بھیج دیا جائے تو کیا میں یہ توقع رکھ سکتا ہوں کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں کسی اور پر ظاہر نہیں ہوں گی؟"

"ہاں! اور اگر آپ واقعی میر جعفر کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں تو قید خانے میں میری دعائیں آپ کے ساتھ ہوں گی پھر جس دن مجھے یہ معلوم ہوگا کہ آپ انگریزوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ مجھے قید سے نکلنے کی اجازت دی جائے۔"

میر قاسم نے سوال کیا: "اگر تمہیں اس وقت آزاد کر دیا جائے تو تم کہاں جاؤ گے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں لیکن میں بنگال میں نہیں رہوں گا۔"

"جاؤ تم آزاد ہو!"

معظم علی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا اور وہ مسرت اور استعجاب کے طے جلے جذبات کے ساتھ میر قاسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میر قاسم نے اپنی مٹھیاں بھیختے ہوئے بلند آواز میں کہا: "میری طرف کیلکھ لے۔"

چند افسروں کا تعاون کافی نہیں۔ اس کے لیے عوام کو بیدار اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ میر قاسم مسکرایا: "موجودہ حالات میں انگریز کے ساتھ لڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لارڈ کلاؤ خود میر جعفر سے تنگ آچکا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "اور اب وہ میر جعفر کی جگہ آپ کو گدے پر بٹھانا چاہتا ہے؟" میر قاسم نے جواب دیا: "میں تمہیں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اگر ہم میر جعفر کو گدے سے اتارنے کے لیے تیار ہو جائیں اور لارڈ کلاؤ کو یہ احساس دلا سکیں کہ اُمراء، سپاہی اور عوام ہنگامہ ساتھ ہیں تو وہ میر جعفر کا ساتھ دینا پسند کرے گا۔"

معظم علی نے کہا: "تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو میر جعفر کی نسبت زیادہ کارآمد سمجھتا ہے؟"

میر قاسم نے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "تم ایک ذہین آدمی ہو تم جانتے ہو کہ موجودہ حالات میں ہم اس قابل نہیں کہ انگریز کے ساتھ ٹکڑے لے سکیں لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے حکومت کا موقع ملا اور تمہارے جیسے لوگوں نے میرا ساتھ دیا تو میں بہت جلد ایک ایسی طاقت منظم کر سکوں گا جو اس ملک کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر سکے۔"

"معظم علی مسکرایا: "آپ انگریزوں کی سرپرستی میں اقتدار کی مندر پر بیٹھ کر ان کے خلاف لڑنے والی فوج منظم کرنا چاہتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ لارڈ کلاؤ آپ سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوگا۔ دیکھیے میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے اس لیے بلا لیا ہے کہ میں اس مہم میں آپ کا ساتھ دوں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میر جعفر کی حکومت پر مطمئن ہو؟" "میں کسی ایسی حکومت پر مطمئن نہیں ہو سکتا جسے لارڈ کلاؤ کی سرپرستی حاصل ہو۔ میں ایک سوراخ میں دوبارہ اٹھ ڈالنے کی غلطی نہیں کر دوں گا۔"

ہو۔ میں کہتا ہوں تم آزاد ہو۔ اگر تم یہ جانتا چلے آتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں آزاد کیا ہے تو سنو۔
پلاسی کی جنگ کے بعد میں نے تم جیسے کئی لوجوانوں کو بغاوت کی سزا پاتے دیکھا ہے اور
میں ہمیشہ اپنے دل کو یہ تسلی دینے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ ہمارے خاندان کے دشمن ہیں لیکن آج
بنگال پر ہمارا خاندان نہیں بلکہ انگریز حکمران ہے۔ آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ الیٹ انڈیا کی
کا ایک معمولی کلرک میرے جتنی نسبت زیادہ اختیارات کا مالک ہے اگر آج سے چند ماہ قبل
کوئی شخص تمہاری طرح میری طرف گستاخ نکالے گا تو میں اس کی آنکھیں نکال لیتا
لیکن اب ہم ہر ذلت کے عادی ہو چکے ہیں۔ الیٹ انڈیا کیسے کے ادنیٰ ملازم ہیں ان کے
کرہانے کی بجائے انگلی کے اشاروں سے جلاتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ تم ایک قیدی
کے لباس میں بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہو۔ کاش میں بھی اسی طرح
لارڈ کلاؤ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتا۔ تم جانتے ہو۔ مجھے اس بات کا
اعتراف ہے کہ میں انگریزوں کے ساتھ نہیں لڑ سکتا لیکن یاد رکھو! جب کبھی موقع آئے
گا ہم ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔

پھر وہ میرے ناصر کی طرف متوجہ ہوا۔ "ناصر! تم نے شرط جیت لی ہے۔ انھیں لے جاؤ
اور میرے نوکرانوں سے کہو انھیں نیا لباس اور گھوڑا دے دیں۔ انھیں مرشد آباد کے باہر
پہنچانا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

گھر سے باہر نکلتے وقت معظم علی، میرے قاسم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا کہ میرے
سے باہر نکل کر اس نے میرے ناصر سے سوال کیا۔ "آپ نے میرے قاسم سے کون سی شرط جیتی ہے؟"
میرے ناصر نے جواب دیا۔ "میرے قاسم کا خیال تھا کہ آپ قید سے رہائی کی امید پر ان کا
ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور میری لئے اس کے خلاف تھی انھوں نے مذاقی
میں کہا تھا کہ اگر معظم علی مجھے دیکھتے ہیں میرے پاؤں پر زگر پڑا تو میں تمہیں دس اشتریاں
انعام دوں گا اور میں نے یہ کہا تھا کہ جس معظم علی کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہوا تھا وہ

اور ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکاسکتے ہیں۔
تھوڑی دیر بعد معظم علی نے کہا۔ "میں اپنی رہائی کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں لیکن
یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ میرے جعفر اور میر مرین کو جب میرے متعلق معلوم ہوگا تو آپ
لوگ کیا جواب دیں گے؟"

میر جعفر اور میر مرین ان دنوں انگریزوں کے لیے روپیہ جمع کرنے کے سوا کچھ نہیں
سوچ سکتے اور میر قاسم اتنے بے اختیار نہیں کہ اپنی مرضی سے ایک قیدی بھی رہا کر سکیں۔
میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ فوراً مرشد آباد سے نکل جائیں اور جلد بنگال کی سرحد عبور
کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ایک دو دن بعد یہ خبر مشورہ کرنی پڑے کہ ایک خطرناک قیدی کو
پھانسی دے دی گئی ہے۔ میر قاسم کے سپاہی آپ کو شہر کے باہر چھوڑ آئیں گے۔

معظم علی نے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں یہاں سے تنہا جاؤں۔ میرے ساتھ
سپاہی دیکھ کر لوگ خواہ مخواہ میری طرف متوجہ ہوں گے۔ میرا تنہا جانا اس لیے بھی ضروری ہے
کہ میں شہر چھوڑنے سے پہلے چند منٹ کے لیے اپنی گھر جانا چاہتا ہوں۔"

میر ناصر نے کہا۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کا گھر نیلام ہو چکا ہے اور اب وہاں
کوئی اور رہتا ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں اپنے نوکر کو تلاش کیے بغیر نہیں جاسکتا۔ محلے میں میرے کئی
دوست ہیں شاید انھیں اس کا پتہ ہو۔ میرے لیے وہاں جانے میں کوئی خلل نہیں لیکن
اگر میں پکڑا گیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے آپ نے قید سے
نکالا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ میں نے ذرا ہونے کی کوشش کی تھی۔"

میر ناصر نے کہا۔ "اگر نوکر کا مسئلہ اس قدر اہم ہے تو میں آپ کو نہیں روک سکتا لیکن
آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بہت سے قیدیوں کو رہا کرنے
کے متعلق سوچ رہے ہیں۔"

”میں پوری احتیاط کر دوں گا۔ اب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مرزا حسین بیگ مرزا باو سے ہجرت کرنے کے بعد کہاں گئے تھے؟“

”میں ان کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ جس قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے تھے وہ کھنڈ کی طرف جارہا تھا اور قافلے میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو کھنڈ سے آگے آگے دہلی اور حیدرآباد جانا چاہتے تھے۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ میرزا ناصر نے کہا: ”آپ یہیں ٹھہریں۔ میں آپ کے لیے نئے لباس اور گھوڑے کا انتظام کرتا ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”اگر بار خاطر نہ ہو تو مجھے ایک خنجر کی بھی ضرورت ہے۔“

میرزا ناصر نے کمرے سے باہر نکلے ہوئے جواب دیا: ”میں آپ کو خنجر کے علاوہ بندوق اور سپتول بھی دے سکتا ہوں۔“

قریباً ایک گھنٹہ بعد معظم علی ایک فوجی افسر کا لباس پہنے اپنے محلے کی ایک سنان گلی میں داخل ہوا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔

”عبداللہ خان! دروازہ کھولو۔“

مکان کا دروازہ کھلا اور معظم علی نے جلدی سے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا: ”عبداللہ! میں معظم علی ہوں۔“

عبداللہ خاں چند ثانیے سکے کے عالم میں کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں معظم علی نے اپنا گھوڑا اندر کھینچ کر دروازہ بند کر لیا۔

عبداللہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا اور بولا: ”مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ میں جاگ رہا ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”باتوں کا وقت نہیں، یہ بتاؤ کہ صابر کہاں ہے؟“

”صابر آپ کے مکان میں رہتا ہے۔ آپ کی گرفتاری کے بعد حکومت نے ایک مکان پیام کر دیا تھا۔ اب وہاں ایک فوجی افسر مقیم ہے اور صابر اس کے پاس نوکر ہے۔ مرزا حسین بیگ ہجرت کے وقت صابر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے کہا میں مرتے دم تک اس مکان میں معظم علی کا انتظار کروں گا۔“

معظم علی نے کہا: ”تھیں معلوم ہے کہ مکان کے مراد جیسے میں اس وقت صابر کے ساتھ اور کون ہوگا؟“

”وہاں اگر کوئی جہان نہیں تو ایک اور نوکر ضرور ہوگا۔“

”مکان کی چھت سے ایک عورت نے آواز دی: ”یہ کون ہیں؟“

”ایک دوست ہیں۔“ عبداللہ نے جواب اور پھر معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ قید خانے سے اس وقت باہر کیسے نکلے؟“

معظم علی نے کہا: ”ان باتوں کا وقت نہیں۔ تم اسی وقت تین چار قابل اعتماد دوستوں کو بلاؤ۔ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔“

تھوڑی دیر بعد معظم علی عبداللہ کے علاوہ اپنے محلے کے چار اور نوجوانوں کے ساتھ جنہوں نے اپنے چہرہ پر نقاب ڈال رکھے تھے، اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رکھا۔ چاند کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ دیوار پچاند گھن میں داخل ہوا۔ صحن میں اصطل کے سامنے دو آدمی کھاؤں پر بیٹے ہوئے تھے۔ معظم علی دیبے پاؤں ڈیوڑھی کی طرف بڑھا اور اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔ عبداللہ اور اس کے باقی ساتھی صحن میں داخل ہوئے اور معظم علی کے اشارے پر اصطل کے سامنے سونے والوں کی کھاؤں کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ معظم علی نے ایک کھاٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں ایک قوی سیلک نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ عبداللہ نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر جگایا اور ہاتھ سے اس کا منہ بند کرتے ہوئے

کہا۔ "تھاری خیر اسی میں ہے کہ تم خاموش رہو۔"
پسے گرد مسلح آدمی دیکھ کر اس نے مزاحمت کی کوشش کی اور معظم علی کے ساتھیوں
نے اسے منہ میں اچھی طرح پکڑا ٹھونس کر اسے چارپائی کے ساتھ جکڑ دیا۔

اس کے بعد معظم علی نے دوسرے آدمی کو جگایا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے
کہا۔ "صابر خاموش! ڈرو نہیں، میں معظم علی ہوں۔"

اور صابر کی حیران بے بس اور خاموش نگاہیں ایک تانیہ کے اندر اندر ہزاروں سوالات کر چکی تھیں۔
معظم علی نے کہا۔ "صابر میرے ساتھ آؤ اور باقی سب یہیں ٹھہریں ہم ابھی لے رہے ہیں۔"
صابر کچھ کہے بغیر معظم علی کے ساتھ اصرطین میں داخل ہوا۔ کھلے دروازوں کے راستے
چاند کی روشنی اصرطین کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کھری پر دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے معظم علی
نے کہا۔ "صابر تم جلدی سے گھوڑوں پر زین ڈالو۔"

اس کے بعد وہ کھری کے دوسرے سرے کی طرف بٹھا اور آخری کھونٹے کے
قریب بیٹھ گیا۔ جب صابر گھوڑوں پر زین ڈالنے کے بعد اس کے پاس آیا تو وہ خنجر سے
زمین کھود رہا تھا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" صابر نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"صابر میں چوری کر رہا ہوں۔"

"چوری! کس چیز کی چوری؟"

"میں اپنے گھر میں اپنے مال کی چوری کر رہا ہوں۔ تم گھوڑے باہر لے چلو۔ میں ابھی
آتا ہوں۔"

صابر گھوڑے کی باگ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنی بغل میں ایک چھوٹی سی تھیلی دبائے باہر نکلا تو اس کے
ایک ساتھی نے سوال کیا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ ہمارا زادراہ ہے۔ آؤ اب چلیں؟"

کوئی آدھ گھنٹہ بعد محلے سے باہر معظم علی اور صابر گھوڑوں پر سوار ہو کر عبداللہ اور دوسرے
روستوں کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

عبداللہ نے آئندہ ہو کر سوال کیا۔ "آپ کی منزل کہاں ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ "میں ایک ایسا مسافر ہوں جس کی کوئی منزل نہیں۔ میں مرزا
حسین بیگ کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اگر کھنڈ میں نہ ملے تو میں دلی جاؤں گا۔ اگر وہاں بھی
نہ ملے تو مجھے حیدرآباد جانا ہوگا۔ اس کے بعد خدا معلوم مجھے کن کن شہروں اور ریسیتوں کی
خاک چھانی پڑے۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ آپ کی گرفتاری
کے کوئی چھ مہینے بعد اکبر خاں یہاں آیا تھا وہ دو دن میرے پاس ٹھہرا تھا اور جاتے وقت
اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر خدا نے مجھے توین دی تو میں ایک فوج لے کر مرشد آباد آؤں گا
اور معظم بھائی کو قید سے نکالوں گا۔"

معظم علی نے سوال کیا۔ "تم نے اس سے مرزا حسین بیگ کے متعلق پوچھا تھا؟"

"ہاں۔ لیکن مرزا حسین بیگ کے متعلق وہ بھی بے خبر تھا اور اس نے یہ کہا تھا کہ میں
کھنڈ جا کر انہیں تلاش کروں گا اور اگر وہ مل گئے تو انہیں اپنے گھر لے جانے کی کوشش
کروں گا۔"

صابر نے کہا۔ "اکبر خاں مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے جواب دیا کہ
میں مرتے دم تک اپنے آٹا کا انتظار کروں گا۔"

گھوڑے پر سوار ہوتے وقت معظم علی نے عبداللہ اور اس کے ساتھیوں سے کہا۔ "اپنے
لوگ میرے ذرا ہونے کے متعلق محلے کے کسی اور آدمی سے ذرا تک نہ کریں۔ میر جعفر کے
آدمیوں کو اگر اس کا علم ہو گیا تو وہ یقیناً ہمدان بھیجا کریں گے۔"

علی الصباح معظم علی اور صاحب نے ایک برساتی ندی کے کنارے گھوڑوں سے اتر کر فجر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد معظم علی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ یہ آنسو ایک لمحے ہوئے مایوس اور بے بس انسان کی آخری پوچھی تھی جسے وہ اپنے وطن کی خاک پر بچھا کر رہا تھا۔ معظم علی نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا: "جبر اور مزار کے مالک میری بد نصیب قوم کو چند افراد کی بد اعمالیوں کی مزار دے۔ ہمیں ان ملت فزوشوں سے نجات دلا جنہوں نے تیرے بندوں کو تیری رحمت سے مایوس کر دیا ہے!"



"آپ مرزا حسین بیگ کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟" وہ مرشد آباد کے بہت بڑے رئیس تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے کھنؤ آئے تھے۔ شاید یہاں ان کے کوئی رشتہ دار تھے۔ آپ کسی ایسے آدمی کا پتہ دے سکتے ہیں جو پلائی کی جگہ کے بعد مرشد آباد سے ہجرت کر کے کھنؤ میں آباد ہوا ہو؟" یہ وہ سوالات تھے جو معظم علی کھنؤ میں چند دن قیام کے دوران سینکڑوں آدمیوں سے پوچھ چکا تھا لیکن کہیں سے اسے تسلی بخش جواب نہ ملا۔

"کھنؤ پہنچ کر معظم علی نے دو دن ایک مراٹے میں گزارے۔ تیسرے دن اس نے اپنی قبیلے سے ایک میرانکالا اور بابہ سواترئی کے عوض کھنؤ کے ایک جوہری کے پاس فروخت کر دیا، اسی شام اس نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اس کے بعد اس کا مولیٰ یہ تھا کہ نہ صبح سویرے اٹھتا اور اپنے بچکے کے نیچے سے جابرات کی قبیلے نکال کر اپنی کمر میں باندھ لیتا اور پھر محلے کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد حسین بیگ کی تلاش میں نکل جلتا زویرات اس نے ایک صندوق میں بند کر دیئے تھے اور اس کی حفاظت صابر کے سپرد کر دی تھی۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال اور کھانا پکانے کے لیے اس نے ایک اور نوکر رکھ لیا تھا جس کا

نام دلاور خاں تھا۔ سارا دن شہر کے عکلوں اور گلیوں میں حسین بیگ کو تلاش کے بعد شام کو تھکا دھلا اور تھکا دھلا سے زیادہ مایوسی سے نڈھال ہو کر گھر آتا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ ہیروں کی پھیلی کمر سے کھول کر تیکے کے نیچے رکھ دیتا۔ صابر کے سوا کسی کو اس کی دولت کا علم نہ تھا۔ اپنے خزانے کا سب سے چھوٹا میرافروخت کرنے کے بعد معظم علی کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ملک کے چند امیر ترین آدمیوں میں سے ایک ہے لیکن اس دولت کے ساتھ مہنی کی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔

ایک امیر آدمی کے لباس میں اسے کھنؤ کے رؤسا، حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں سے متعارف ہونے میں کوئی وقت پیش نہ آئی۔ دس دن کی پیہم جستجو کے بعد ایک دوپہر وہ کھنؤ کے ایک بانار سے گزر رہا تھا کہ ایک عمر رسیدہ آدمی اس کے سامنے آکر اچانک مڑکا اور اس کی طرف بھڑک دیکھنے کے بعد معظم علی! معظم! کہتا ہوا لپٹ گیا۔

"آپ شیر علی ہیں؟" معظم علی نے قد سے توقف کے بعد کہا۔

"ہاں" اس نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے آسانی سے نہیں

پہچانو گے۔ مجھے یہاں مرشد آباد کے کئی آدمی ملے ہیں لیکن ایک دو کے سوا مجھے کوئی نہیں

پہچان سکا اور تم بھی تو بہت بدل گئے ہو۔ تم قید سے کب رہا ہوئے اور یہاں کب آئے؟

"میں کوئی دس روز سے یہاں ہوں اور مرزا حسین بیگ کو تلاش کر رہا ہوں۔ شاید آپ

کران کے متعلق کچھ معلوم ہو؟"

شیر علی نے جواب دیا: "مرزا صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

ایک ثانیہ کے لیے معظم علی کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ وہ بھٹی پھٹی آنکھوں سے شیر علی

کی طرف دیکھ رہا تھا۔

شیر علی نے کہا: "میں نے ان سے ایک ماہ بعد مرشد آباد سے ہجرت کی تھی۔ کھنؤ

شیر علی کا لباس اس کی مغلی اور تنگ دستی کا آئینہ دار تھا۔

مغظم علی نے پوچھا: یہاں آپ کیا کرتے ہیں؟

شیر علی نے جواب دیا: کچھ نہیں۔ جب میں مرشد آباد سے آیا تھا تو میرے پاس کچھ روپیہ تھا۔ یہاں ایک ساتھی نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم بنارس چل کر کوئی کاروبار شروع کریں بنارس جا کر میں تجارت میں نفع کمائے اپنی رہی ہوئی سب کچھ گنوا بیٹھا اور اب کسی ملازمت کی تلاش میں ہوں لیکن یہاں ایک بوڑھے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

مغظم علی نے کہا: آپ کو ملازمت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں چلیے میرے

ساتھ ۱

کہاں؟

میرے مکان پر؟

لیکن میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کیا کرتے ہیں؟

مغظم علی نے جواب دیا: میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

لیکن اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو ممکن ہے میں آپ کے ساتھ شریک ہو جاؤں۔

لیکن تجارت کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے؟

سرمائے کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس بہت

کچھ ہے۔

شیر علی نے کہا: میں اپنی خاطر آپ کو تجارت کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آپ ایک

سپاہی ہیں اور اپنے تجربے اور ذہنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ادھ کی فوج میں بہترین

عہدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

مغظم علی نے کہا: بچا شیر علی خدا کے لیے فوج کی ملازمت کا ذکر نہ کیجیے۔ میں یہ

فیصلہ کر چکا ہوں کہ باقی عمر ان نام نہاد حکمرانوں کے لیے تلوار نہیں اٹھاؤں گا، جنہوں نے

پہنچ کر مجھے چند ایسے آدمی ملے جو مرشد آباد سے مرزا صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے تھے مجھے ان کی زبانی پتہ ملا کہ مرزا صاحب ادھ کی سرحد میں داخل ہوتے ہی بیمار ہو گئے تھے اور ایک بستی کے زمیندار نے انہیں اپنے پاس ٹھہرا لیا تھا۔ لکھنؤ میں مرزا صاحب کے ایک ماموں زاد بھائی رہتے تھے اور میرا خیال تھا کہ مرزا صاحب ان کے پاس پہنچ گئے ہوں گے لیکن جب میں نے انہیں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پلاسی کی جنگ سے چند ماہ قبل لکھنؤ سے ہجرت کر کے دکن جا چکے ہیں۔ پھر میں نے اس بستی کا رخ کیا جہاں مرزا صاحب کے ٹھہرنے کی اطلاع ملی تھی لیکن وہاں سپن کر گاؤں کے زمیندار سے یہ خبر سنی کہ وہ چار دن موت و حیات کی کھٹش میں مبتلا رہنے کے بعد وفات پا گئے تھے اور انہیں گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ گاؤں کے زمیندار نے مجھے ان کی قبر بھی دکھائی تھی۔

مغظم علی نے کہا: لیکن ان کے ساتھ ان کی بیوی اور لڑکی بھی تھیں؟

انہیں گاؤں کے زمیندار نے چند دن اپنے پاس مہمان رکھا تھا اس کے بعد بنگال سے تارکان وطن کا ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا۔ وہ اس قافلے کے ساتھ شامل ہو گئیں اس قافلے میں بعض آدمی لکھنؤ اور فیض آباد اور بعض آگرہ اور دلی جانے والے تھے۔ میں نے لکھنؤ واپس آ کر پتہ کیا لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ان کے ساتھ دو نوکر بھی تھے اور میرا خیال ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی لکھنؤ سے اپنے عزیزوں کا پتہ کرنے کے بعد دلی یا حیدر آباد جا چکی ہیں۔ کیونکہ ان کے خاندان کے بہت سے افراد ان دونوں شہروں میں ہیں۔

مغظم علی نے سوال کیا: آپ کو مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی کا نام معلوم ہے؟

ہاں، ان کا نام ارشد بیگ تھا۔

آپ کو دہلی میں ان کے کسی رشتہ دار کا نام معلوم ہے؟

نہیں۔

قوم کو ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا۔

معظم علی نے دو ہفتے اور گھنٹوں میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں وہ صبح سے شام تک فرحت اور اس کی ماں کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ رات کے وقت جب کبھی شیر علی کو اس کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ اکثر یہ کہتا: "معظم اگر تمہارے پاس تارون کا خزانہ ہو تو بھی ہمیں بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی کام منرو کرنا پڑے گا۔" معظم علی جواب دیتا: "ہاں چچا جان میں سوچ رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو بہت جلد کسی کام پر لگا دیا جائے گا۔"

ایک رات تیسرے پہر شیر علی سو رہا تھا۔ معظم علی نے اسے جگایا اور کہا: "چچا شیر علی میں کچھ عرصہ کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ دلا درخاں میرے ساتھ جائے گا اور صابر آپ کی خدمت میں رہے گا۔ یہ لیجیے اس تھیلی میں پانچ سواشرنیاں ہیں۔ میری غیر حاضری میں آپ کے اخراجات کے لیے یہ کافی ہوں گی۔"

• آپ کہاں جا رہے ہیں؟ "شیر علی نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

"میرا مقصد فرحت اور اس کی دالہ کو تلاش کرنا ہے۔ میں پہلے فیض آباد جاؤں گا۔ اس کے بعد روہیلکھنڈ ایک دومت کے پاس جاؤں گا۔ پھر مگن ہے مجھے اگرہ؛ دلی اور حیدر آباد کی خاک چھانی پڑے۔"

شیر علی نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں اس عمر میں آپ کے لیے اتنا طویل سفر ٹھیک نہیں۔ میری واپسی تک آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ میں کون سا کاروبار شروع کرنا چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اور دلا درخاں گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے۔ اور شیر علی اور صابر مکان کے دروازے کے سامنے کھڑے انھیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ دلا درخاں کوئی چالیس برس کا ایک دراز قامت، قوی، ہیکل آدمی تھا اور چند دنوں میں معظم علی کا قابل اعتماد ساتھی

بن چکا تھا۔

گھنے جنگل میں غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہی شام کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اداس اور منہمک فضا میں معظم علی اور دلا درخاں اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں پر سوار تھے۔ آگے بڑھ رہے تھے کبھی کبھی کوئی گیدڑ، خرگوش، ہرن یا بھیڑ بھاگنے درختوں سے نودار ہوتا اور پگڑی بڑی عبور کر کے دوسری طرف دوپوش ہو جاتا۔

ایک چھوٹی سی ندی عبور کرنے کے بعد معظم علی نے اپنے ساتھی سے کہا: "یہاں سے تھوڑی دور آگے دائیں ہاتھ ایک اور پگڑی آئے گی جو اکبر خاں کے گاؤں کو جاتی ہے۔ ذرا خیال رکھنا اگر ہم اس پگڑی سے آگے نکل گئے تو ساری رات جنگل میں بھٹکتے رہیں گے۔"

دلا درخاں نے جواب دیا: "جناب بھٹکنے کے لیے یہ جنگل موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے تو یہ بہتر تھا ہم کچھلی بستی میں رک گئے ہوتے۔"

معظم علی نے کچھ کہنے کی بجائے ایڑ لگا کر اپنے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ کوئی آدھ میل چلنے کے بعد اسے اپنے دائیں ہاتھ ایک پگڑی دکھائی دی اور اس نے اپنا گھوڑا موڑتے ہوئے کہا: "اب ہم پہنچ گئے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر ایک ٹیلہ ہے۔ ٹیلہ عبور کرنے کے بعد ہم ایک جھیل کے کنارے کنارے تھوڑی دیر جائیں گے۔ اس کے بعد ایک بڑا ٹیلہ آئے گا جسے عبور کرنے کے بعد ہم جنگل سے نکل کر اکبر خاں کے گاؤں کے کھیتوں میں داخل ہو جائیں گے۔"

دلا درخاں کچھ کہے بغیر معظم علی کے پیچھے ہولیا۔ تنگ پگڑی پر تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے ٹیلے کے قریب پہنچے۔ وہ گھوڑوں نے ٹھٹھک کر کان کھڑے کر لیے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ معظم علی اور دلا درخاں پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ انھیں کسی بکرے کی میا ہٹ سنا دی۔ دلا درخاں نے اطمینان کا سانس

لیتے ہوئے کہا: اگر کسی ریڑ سے بھرتے ہوئے بکرے کی آواز نہیں تو ہم کسی بستی کے قریب پہنچ چکے ہیں:

جہاں تک مجھے معلوم ہے یہاں اس پاس کوئی بستی نہیں اور ایسے جنگل میں بکرے اپنے ریڑ سے بچرنا پسند نہیں کرتے۔ معظم علی نے یہ کہہ کر گھوڑے لگا دیے اور اس گھوڑے نے چند چھلانگیں لگائیں لیکن ٹیلے کی چوٹی سے کوئی مین قدم دور پہنچ کر آگے بڑھنے کی بجائے پھلی مانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ معظم علی نے مڑ کر دیکھا تو دلا درخان کا گھوڑا بھی اسے پاؤں پیچے بٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معظم علی اپنی بندوق سنبھال کر گھوڑے سے اتر پڑا اور دلا درخان نے اس کی تعظیم کی۔

معظم علی نے کہا: تم گھوڑے سنبھالو۔ معلوم ہوتا ہے انھیں کسی درندے کی بو آگئی ہے۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں:

دلا درخان نے گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں۔ معظم علی نے گھنے جنگل میں ادھر ادھر دیکھا اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ٹیلے سے آگے ایک چھوٹی سی جھیل تھی اور پگڑندی جھیل کے کنارے ایک نصف دائرہ بنانے کے بعد دوسری جانب درختوں میں غائب ہو جاتی تھی۔ جھیل کے کنارے درخت نسبتاً کم تھے۔ بکرے کی کرب اگرچہ جینیں بدستور سناں دے رہی تھیں۔ غم نے پیچھے مڑ کر دلا درخان کو اشارہ کیا اور وہ اچھلتے کودتے بدکتے ہوئے گھوڑوں کو کھینچتا آگے بڑھا۔

معظم علی نے کہا: اگر میں غلطی پر نہیں تو مغربی بہ کسی شکاری سے ملنے والے ہیں بکرہ جھیل کے کنارے پگڑندی کے پاس ہی کسی درخت کے نیچے بندھا ہوا ہے اور شیر یا چیتا بھی کہیں اس پاس جکڑ کاٹ رہا ہے۔ اب شام ہو رہی ہے۔ ہمارے لیے یہاں سے جلد نکل جانا بہتر ہے۔ تم گھوڑوں کو جھیل کے ساتھ ساتھ رکھو اور میں جنگل کی طرف رہوں گا۔

دلا درخان نے گھوڑوں کی باگیں کھینچتے ہوئے کہا: خدا کی قسم میں شیر سے نہیں ڈرتا لیکن اس بکرے کی ہرجیج کے ساتھ میرا ایک سیرخون خشک ہوا جاتا ہے۔ اگر یہ کوئی بھوت نہیں تو آپ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں!

ٹیلے سے نیچے اترتے ہی معظم علی کو اپنے دائیں ہاتھ گھنی جھاڑیوں میں پتوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور وہ جلدی سے زمین پر بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک درختوں کے درمیان پھیلی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں اسے ایک شیر دکھائی دیا۔ معظم علی نے جلدی سے اپنی بندوق سیدھی کی۔ شیر ایک ثانید کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک خوفناک گرج کے ساتھ چھلانگیں لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ معظم علی نے گولی چلا دی۔ زخمی درندے نے دو تین پلٹیاں کھائیں اور پھر پوری قوت سے آخری جست لگا کر معظم علی سے چند قدم کے فاصلے پر ڈھیر ہو گیا۔

معظم علی ایک لمحہ کے لیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اپنے تھیلے سے بارود نکال کر بندوق بھرنے لگا۔ ابھی وہ اس سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے پیچھے جھاڑیوں میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو مہبوت سا بکرہ گیا۔ ایک شیرنی کوئی پندرہ مین گز کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ سے نمودار ہوئی اور دھاتی ہوئی معظم علی کی طرف بڑھی۔ معظم علی کے لیے بندوق بھرنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے بندوق پھینک دی اور جلدی سے تیار نکال کر ایک طرف بٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا پاؤں ایک درخت کی جڑ کے ساتھ ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی جنگل کی فضا بندوق کے دھماکے سے گونج اٹھی۔ معظم علی جو ایک ثانید قبل موت کا بھیانک چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اٹھا تو اسے صرف چار قدم کے فاصلے پر شیرنی دم توڑتی دکھائی دی۔ پھر اسے ایک دلکش آواز سنائی دی: ہا آپ کو چوٹ تو نہیں آئی!

معظم علی جواب دینے کی بجائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ ایک درخت

کی آڑ سے ایک نوجوان نمودار ہوا اور فاحشانہ انداز سے آگے بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔

”بھائی جان! وہ قریب پہنچ کر بلند آواز میں چلایا اور اپنی بندوق پھینک کر بھاگتا ہوا معظم علی کے ساتھ پیٹ گیا۔

اکبر۔ اتم۔۔۔۔۔ تم اتنی جلدی جوان ہو گئے؟

اکبر نے کہا: ”بھائی جان شیر مارنے کے بعد آپ کو اس قدر بے پروا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ شیرنی آپ کے سر پر چلی تھی“

معظم علی نے جواب دیا: ”میں بندوق بھر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بروقت پہنچ گئے۔ میں نے بکرے کی چمچیں سن کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ جنگل میں کوئی شکاری موجود ہے۔ اکبر خاں نے کہا: ”اس جوڑے نے ہمارے کئی مویشی ہلاک کیے ہیں۔ اس لیے میں نے آج بکرا بندھوایا تھا۔ جب آپ ٹیلے سے نیچے اتر رہے تھے میں نے شیر کو آپ کی تاک میں جلتے دیکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی مسافر رات بھول کر اس طرف آنکلا ہے میں آپ کو خبردار کرنے کی نیت سے نیچے اتر لیا۔ آپ درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو چکے تھے، پھر میں بندوق کی آواز سن کر اس طرف بھاگا تو یہ شیرنی نظر آئی۔ میں مرشد لگا دیا تھا آپ قید سے کب رہا ہوئے؟“

معظم علی نے جواب دیا: ”اکبر ہم اس جنگل سے نکل کر اطمینان کے ساتھ باتیں کریں گے۔“

”چلیے۔ اکبر خاں نے کہا: یہ آپ کا ساتھی کون ہے۔ میں نے اسے جھیل کے کنارے بدحواس گھوڑوں سے زرد آرمائی کرتے دیکھا ہے۔“

”وہ میرا نوکر ہے۔“

دو اپنی اپنی بندوقیں اٹھا کر پل پڑے۔ راستے میں اکبر خاں کے تین اور ساتھی ان کے

ساتھ شامل ہو گئے۔ جھیل کی طرف دلا درخاں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں سے نکل کر انھیں ایک دلچسپ منظر دکھائی دیا۔ دلا درخاں کنارے سے چند قدم دور جھیل کے اندر وحشت زدہ گھوڑوں کی باگیں پڑے انھیں بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا۔ ایک دیہاتی جس نے ایک بکری سے کارٹر پکڑ رکھا تھا، کنارے پر کھڑا مائے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ایک گھوڑے نے اچانک اچھل کر دلا درخاں کے ہاتھ سے باگ چڑھائی اور چند قدم دور نکل گیا۔ دلا درخاں کو اس پریشانی کی حالت میں دیہاتی کی ہنسی بے ناگوار محسوس ہوئی اور اس نے بلند آواز میں کہا: ”ارے یا تم عجیب بیوقوف ہو۔ جھیل یہ ہنسنے کی کوئی بات ہے خدا کے لیے اس بکرے کو یہاں سے لے جاؤ یہ بیوقوف جانور اسے بھی شیر سمجھتے ہیں۔“

دیہاتی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ”ابے نہیں گھوڑے، بکرے کو شیر نہیں سمجھتے بلکہ تمھیں بھوت سمجھ کر ڈر گئے ہیں۔“

دلا درخاں کو انتہائی بے بسی کی حالت میں بھی بھوت کہنا نا پسند نہ تھا۔ دو دیہاتی کو جواب دینے کے لیے موزوں الفاظ سوچ رہا تھا کہ اس کی توجہ معظم علی اور دوسرے آدمیوں کی طرف مبذول ہو گئی اور اس کا سارا غصہ جاتا رہا اس نے معظم علی کی طرف دیکھ کر کہا: ”آپ ٹھیک ہیں نا؟“

معظم علی نے جواب دیا: ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہم نے دو شیر مار لیے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ تم باہر آ جاؤ۔“

دلا درخاں نے آزدہ ہو کر کہا: ”واہ جی! آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں شیر سے ڈر رہا ہوں میں گھس گیا تھا۔ ذرا کی قسم یہ گھوڑے نہیں لگتے ہیں۔ اگرچہ کبھی ایسا وقت آیا تو میں انہیں سنبھالنے کی بجائے شیر کے سامنے ٹھہرا ہوا جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے تیرا آنا ہے درز آپ کو میری لاش بھی نہ ملتی۔“

معظم علی نے سوال کیا: تمہارے بھائی جان کا کیا حال ہے؟
 ”بھائی جان کو فوت ہوئے قریباً تین مہینے ہو چکے ہیں۔ ہمارے علاقے پر مرہٹوں
 نے حملہ کر دیا تھا اور وہ لڑائی میں مارے گئے تھے۔“
 چند دن بعد معظم علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے اکبر خان کے کندھے
 پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”اکبر مجھے ان کی موت کا بہت افسوس ہے۔“
 اکبر خان نے کہا: ”بھائی جان نے ایک بہادر کی طرح جان دی تھی۔ ان کے جسم
 پر تین گولیوں کے اوپر پانچ توار کے زخم تھے۔“
 معظم علی نے پانچ دن اکبر خان کے گھر قیام کیا۔ اس کے بعد جب اس نے آگرہ
 اور دہلی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اکبر خان نے اس کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن معظم علی
 نے کہا: ”اکبر خان تم اب اپنے علاقے کے سردار ہو۔ تمہارا گھر رہا ضروری ہے۔ میں
 تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں، لیکن تم میرے ساتھ جا کر میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔
 اکبر خان نے کہا: ”بھائی جان میں آپ کی خاطر نہیں جانا چاہتا۔ بلکہ مجھے آگرہ اور
 دہلی دیکھنے کا شوق ہے۔ میں حیدر آباد بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں چچا جان کے ہوتے ہوئے
 میری غیر حاضری بہت زیادہ محسوس نہیں کی جائے گی۔“
 معظم علی نے کچھ سوچ کر جواب دیا: ”بہت اچھا اگر تمہارا یہی ارادہ ہے تو پھر تیار ہو جاؤ
 ہم پرسوں صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“
 اکبر خان نے جواب دیا: ”میں بالکل تیار ہوں۔“
 تیسرے روز رات کے پچھلے پہر اکبر خان نے معظم علی کو جگایا اور کہا: ”بھائی جان
 اچھے اب صبح ہونے والی ہے۔“
 معظم علی تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو ڈیوڑھی کے سامنے گھوڑوں کی قطار دکھائی
 دی۔ اکبر خان کا چچا چند مسلح نو جوانوں کے ساتھ بائیں کر رہا تھا معظم علی نے اکبر خان سے سوال

اکبر خان نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: ”نہیں بھائی اس طرف جھیل کا پانی
 زیادہ گہرا نہیں۔ اگر تمہیں تیز نہ آتا تو بھی ڈوب جانے کا خطرہ نہ تھا۔“
 معظم علی نے کہا: ”دلا درخان اب تم شر چلانے کی بجائے باہر نکل آؤ تو گھوڑے
 خود بخود ہمارے پاس آئیں گے۔“
 ”نہیں جناب! جب تک یہ کبرا کنارے پر کھڑا ہے۔ یہ باہر نہیں نکلیں گے۔“
 ”بھئی تم باہر تو نکلو!“
 دلا درخان نے بدول ہو کر گھوڑوں کی گاس چھوڑ دیں اور خود پانی سے باہر نکل آیا جب
 وہ کنارے پر پہنچا تو گھوڑے بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ دلا درخان
 نے کہا: ”خدا کی قسم میرا جی چاہتا ہے کہ ان دونوں کو گولی مار دوں!“
 اکبر خان کے اشارے پر دو آدمیوں نے گھوڑے پکڑ لیے اور یہ لوگ جھیل کے کنارے
 کنارے پکڑ پکڑ پڑ پڑ دیئے۔ شام کا دھند لکا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ جنگل میں
 گیدڑوں، بیڑیوں اور دوسرے وحشی جانوروں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔
 معظم علی، اکبر خان کے ان گنت سوالات کے جواب میں اسے اپنی قید اور رہائی
 کی داستان سنا رہا تھا۔ جب اس نے اپنی مرگ و نشنت ختم کی تو اکبر خان نے کہا: ”اگر
 مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لکھنؤ پہنچ گئے ہیں تو میں فوراً وہاں آتا۔“
 ”لکھنؤ میں میرا قیام بہت مختصر تھا۔ میں دہلی سے فیض آباد چلا گیا تھا اور فیض آباد
 سے اودھ کے چند شہروں کی خاک چھانسنے کے بعد تمہارے پاس آیا ہوں۔ میرا خیال تھا
 کہ شاید تمہیں مرزا صاحب کے متعلق کچھ معلوم ہو۔“
 اکبر خان نے مفوم سمجھ لیا کہ کاش مجھے کچھ معلوم ہوتا۔ میں نے مرشد آباد سے
 دہلی پر لکھنؤ میں انہیں تلاش کیا تھا۔ اب اگر آپ دہلی، آگرہ اور حیدر آباد جانا چاہتے ہیں تو
 میں آپ کا ساتھ دوں گا۔“

گیا رھواں باب

دلی تک سفر کے دوران میں معظم علی کے تمام خیالات فرحت پر مرکوز تھے۔ وہ راستے کے پر رونق شہروں سے مایوس ہو کر نکلتا تو اپنے دل کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا کہ فرحت آگے کسی بستی میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پھر جب اسے بستی کے لوگوں سے مل کر مایوسی ہوتی تو اس کی نگاہیں فرحت کو راستے کے جنگلوں اور سیلابوں میں تلاش کرتیں۔ کبھی کوئی قافلہ نظر پڑتا تو وہ قریب جا کر پوچھتا: آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ کے ساتھ شہزادہ کا کوئی آدمی تو نہیں؟ مسافر اس کی باتوں پر مسکراتے اور جھٹکتے گزر جاتے، پھر وہ اکبر خاں سے کہتا: اکبر شاید میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس قافلے میں نہیں ہوں گی لیکن اس کے باوجود میں یہ سب جانتا ہوں کہ مجھے دلی پہنچ کر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن میں خود قریبی میں مبتلا رہنا چاہتا ہوں۔ اب وہ وہ امیدیں میری زندگی کا آخری سہارا بن چکی ہیں۔ مجھے انہوں سے ریں نے تمہیں خواہ مخواہ اپنے ساتھ لاکر پیشان کیا۔

اکبر خاں اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا: بھائی جان آپ کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

ایک شام دلی سے دو منزلیں اور دو ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئے۔ بستی کا چودھری ایک شریف، انفس راجپوت تھا۔ اس نے انہیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ جب سطل مل گیا اسے یہ بتایا کہ میں اپنے بھروسے ہوئے عاریوں کی قوش میں دلی جا رہا ہوں۔ تو وہ رسیہ

کیا یہ سب آدمی ہمارے ساتھ جائیں گے؟
 ”چچا جان تو میں آدمی بھیجے پر مصر تھے۔ میں نے بڑی شکل سے انہیں آٹھ آدمی لے جانے پر رضا مند کیا ہے۔“
 اکبر خاں کے چچا نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا: ”میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں زیادہ آدمی لے جانے چاہئیں۔“
 اکبر خاں نے کہا: ”چچا جان ہم دلی دیکھنے جا رہے ہیں، دلی لوٹنے کے لیے تو نہیں جا رہے ہیں۔“

”برخوردار! دلی لوٹنے کے لیے تمہیں یہاں سے آدمی لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ان دنوں یہ حالت ہے کہ اگر تم لال قلعہ کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اعلان کرو کہ میں دلی لوٹنے آیا ہوں تو وہیں سے تمہیں ہزاروں مددگار مل جائیں گے۔ تمہیں راستے میں اپنی حفاظت کے لیے آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔ پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا: ”آپ اکبر خاں کا خیال رکھیں۔ یہ آٹھ آدمی جنہیں آپ کے ساتھ روانہ کر رہے ہیں۔ ہمارے قبیلے کے بہترین نشانہ باز ہیں۔ خطرے کے وقت آپ ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔“
 تھوڑی دیر بعد گیارہ آدمیوں کا یہ قافلہ گاؤں سے باہر نکل رہا تھا۔

میزبان نے کہا: "برخوردار مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ لوگ اس شان و شوکت کے ساتھ دلی گئے تو آپ کے باقی عزیز شاید تمام عمر آپ کو تلاش کرتے رہیں۔ دلی پر اب مرثوں کا راج ہے۔ وہاں آپ کا لباس، آپ کے گھوڑے اور آپ کے ہتھیار آپ کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں گے۔ پھر اگر آپ مرثوں کی نگاہ سے بچ کر شہر میں داخل ہو جائیں تو سبھی ہزاروں آدمی وہاں آپ کے لیے سروردی کا باعث ہوں گے۔ دلی میں اگر آپ کو کوئی خطرہ پیش آیا تو آٹھ دس آدمی آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ آپ کے لیے یہی مناسب ہے کہ جب آپ شہر میں داخل ہوں تو کسی کو آپ پر شبہ نہ ہو کہ آپ بہت امیر ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا: "میں راستے میں دلی کے حالات سن چکا ہوں اور اتنے آدمیوں کو وہاں لے جاؤں میں بھی قلعہ بندی نہیں سمجھتا۔ میرا ارادہ ہے کہ انھیں اگلی منزل سے واپس کر دوں گا یا راستے کی کسی بستی میں چھوڑ دوں گا اور اگر آپ ان لوگوں کو اپنے پاس ٹھہرا سکیں تو بہت نوازش ہوگی۔"

میزبان نے جواب دیا: "میرے پاس آپ کے ساتھیوں کے لیے بہت جگہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی اپنا گھوڑا یہیں چھوڑ دیں۔ میرے گاؤں سے کل اناج کے چند چھکڑے دلی جا رہے ہیں اور اگر آپ ایک عام دیہاتی کا لباس پہننا پسند کریں تو میں آپ کو ان کے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔"

معظم علی نے کہا: "مجھے ننگے پاؤں چلنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں صرف ایک آدمی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور میرے باقی ساتھی میری دالپی تک یہاں رہیں گے۔ پھر وہ اکبر خاں کی طرف متوجہ ہوا: "اکبر خاں تم اگر واپس نہیں جانا چاہتے تو تمہیں چند دن یہاں رہنا پڑے گا۔ میں صرف دلاور خاں کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اکبر خاں نے بھڑک کر کہا: "نہیں بھائی جان میں آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔"

آپ دلاور خاں کو میرے نوکر دوں کے ساتھ چھوڑ دیں۔"

معظم علی نے جواب دیا: "نہیں اکبر خاں یہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔ اکبر خاں نے میزبان کی موجودگی میں معظم علی کے ساتھ بحث کرنا پسند نہ کیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب یہ لوگ ایک چھوٹی سی حویلی کے صحن میں سو رہے تھے۔ اکبر خاں نے آواز دی: "بھائی جان!"

کیا ہے اکبر! تمہیں نیند نہیں آتی؟" معظم علی نے اپنی چارپائی پر کدوٹ بدلتے ہوئے کہا!

نہیں بھائی جان! میں سوچ رہا ہوں کہ آپ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جانا چاہتے۔"

"اکبر اگر دلی کے حالات ٹھیک ہوتے تو میں یقیناً تمہیں بھی ساتھ لے جاتا۔ دلی کے حالات تو کبھی ٹھیک نہیں ہوتے۔ پھر وہاں جانے میں اگر آپ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دوں۔"

معظم علی نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا: "اکبر تمہیں یہاں ٹھہرانے کی ایک خاص وجہ ہے۔ سو میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جسے دلی لے جانا خطرناک ہے اور یہ چیز میں تھا کہ حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کی حفاظت کر اکبر خاں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا: "وہ کیا چیز ہے بھائی جان؟"

"ابھی بتاتا ہوں: یہ کہہ کر معظم علی نے اپنی قمیص کے نیچے کمر کے ساتھ بندھی ہوئی تھیلی اتاری اور اکبر خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ لو!"

اکبر خاں نے اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے اٹھ آگے بڑھا کر تھیلی کھلی اور پوچھا: "اس میں کیا ہے؟"

”ہم سے“ معظم علی نے مرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”اس قیسی کو اپنی کمر کے ساتھ
باندھ لو اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔“

اکبر خاں نے کہا۔ ”اگر یہ سچ میرے ہیں تو یقین رکھیے کہ اب آپ کی واپسی
بمبے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں آئے گی۔“

اکبر یہ تمہاری نیند سے زیادہ قیمتی نہیں۔ اب آرام سے سو جاؤ اور دیکھو اگر مجھے زیادہ
دلی ٹھہرنا پڑا تو میں دلاور خاں کو واپس بھیج دوں گا۔ پھر تمہارے لیے یہ بہتر ہوگا کہ تم یہاں
شہر نے کی بجائے گھر چلے جاؤ اور میں اگر زندہ رہا تو وہاں پہنچ جاؤں گا۔



تیسرے دن معظم علی اور دلاور خاں گاڑی بانوں کے لباس میں دلی پہنچے۔ شہر کے
ناکوں پر مرہٹہ سپاہی باہر سے آنے والے ہر سفید پوش کی تلاش لیتے تھے اور اس کی
جیب سے جو کچھ نکلتا تھا وہ جتنی مرہٹہ سرکار ضبط کر لیا جاتا تھا۔ بسا اوقات شہر میں داخل
ہونے والوں کو اپنے ابطے پکڑوں کے بدلے کسی مرہٹہ سپاہی کا بوسیدہ لباس زیب تن کرنا
پڑتا تھا لیکن شہر میں غلہ، مہزی اور ایندھن پسپائی کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ معظم علی
نے جامع مسجد سے تھوڑی دیر ایک سرائے میں قیام کیا اور تھوڑی دیر بعد بازاروں، گلیوں
اور خانقاہوں میں فرشت اور اس کی ماں کی تلاش شروع کر دی۔ انے نے سرائے کے مالک
کے توسط سے چند منادی کرنے والوں کو بلایا اور انھیں مرشد آباد سے مرزا حسین بیگ کے
کسی شناسا کا سرائے دکھانے کے کام پر لگا دیا۔

دلی میں قیام کے دوران میں معظم علی نے مسلمانوں کی زبان حالی کے جو مناظر دیکھے
۔۔ انتہائی دلخیز تھے۔ نام نہاد شہنشاہ کی حکومت لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔
امرا ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ لال قلعہ سے باہر نیرون اور
ربڑوں کی بادشاہت تھی۔ گلیوں اور بازاروں میں مرہٹہ سپاہیوں کے گھوڑے دوڑتے

تھے۔ شہنشاہ کے تمام احکامات مرہٹہ فوج کے سردار کی خواہشات کے مطابق ہوتے
تھے۔ دلی سے آگے مرہٹوں کی جارحیت کا سیلاب لاہور، ملتان اور سرسند کا رخ کر رہا تھا۔
شمال مغربی ہندوستان، بھیڑ یا خصلت انسانوں کے لیے ایک وسیع شکار گاہ بن گیا تھا۔
مسلمانوں کے وہ دفاعی قلعے جو درگ زب عالمی نے تعمیر کیے تھے، ایک ایک کر کے ٹوٹ
رہے تھے۔ دروازہ شدوں اور سبوتوں کے لوگ اپنے شہنشاہ اور اس کے وڈیوں اور امیروں
کے پاس فراریوں لے کر آتے لیکن دلی پہنچ کر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ لال قلعہ کے صحن ان
سے زیادہ مجبور، ان سے زیادہ بے بس اور مظلوم ہیں۔ قسم رسیدہ انسانیت کسی نجات دہندہ
کی منتظر تھی۔ انسانیت اور شرافت کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مسلمان چھپ
چھپ کر مسجدوں اور بزرگان دین کی خانقاہوں میں دعائیں کرتے تھے علامتے دین احمد شاہ اہل
کو اس قسم کے پیغامات بھیج رہے تھے۔ ”مرہٹوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔
اب آپ اس ملک کے مظلوم انسانوں کا آخری سہارا ہیں۔“

معظم علی آٹھ دن دلی میں سرگرداں رہا۔ اس عرصہ میں اسے مرشد آباد کے کئی
آدمی ملے جنہوں نے مرزا حسین بیگ کے ساتھ ہجرت کی تھی لیکن اس سے زیادہ کوئی
نہ بتا سکا کہ وہ علامت کے باعث راستے کی ایک بستی میں رک گئے تھے۔

ایک شام معظم علی دن بھر کی جستجو کے بعد سرائے میں پہنچا تو اس کے کمرے
میں ایک عمر رسیدہ آدمی دلاور خاں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دلاور خاں نے اٹھ کر کہا۔
”جناب یہ مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار ہیں۔“ معظم علی کا دل دھڑکنے لگا۔

عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ ”مرزا حسین بیگ ہمارے دور کے رشتہ دار تھے۔ آج میں
نے جامع مسجد میں یہ اعلان سنا کہ آپ انھیں تلاش کر رہے ہیں۔“

معظم علی کا دل بیٹھ گیا اور اس نے کہا۔ ”مرزا صاحب وفات پا چکے ہیں۔ میں
کے بال بچوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہے؟“

جو وقت کی آنکھوں اور طوفانوں سے لڑ سکتا ہو۔ ہم تاریک رات کے مسافر ہیں اور ہمیں روشنی کے ایک مینار کی ضرورت ہے۔



دو دن پیدل سفر کرنے کے بعد معظم علی دوبارہ اپنے ساتھیوں سے جاملہ اور چوتھے روز یہ لوگ حیدرآباد دکن کا رخ کر رہے تھے۔ کوئی چھ منزلیں طے کرنے کے بعد گیارہ آدمیوں کے اس قافلے کے ساتھ چھ سو اوروں شامل ہو گئے اور انھوں نے یہ بتایا کہ ہم دلی چھوڑ کر نظام کی فوج میں ملازمت حاصل کرنے کے ارادے سے دکن جا رہے ہیں۔ راستے کی بسیتوں سے معظم علی کو یہ اطلاع ملی کہ قریباً اڑھائی سو مسافروں کا ایک قافلہ ایک ہفتہ قبل اس راستے سے گزرا ہے۔ راستے میں معظم علی کے نئے ساتھی اس سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ اکبر خاں انھیں مرغوب کرنے کے لیے یہ بتا چکا تھا کہ معظم علی بنگال کی فوج کا ایک بہت بڑا انصرہ چکا ہے۔

کئی دن کے سفر کے بعد معظم علی اور اس کے ساتھی ایک دو پہر ایک پہاڑی ندی کے کنارے سستانے کے لیے رکے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ درختوں کی چھاؤں میں آرام کرنے کے بعد وہ کوچ کی تیاری کر رہے تھے کہ انہیں سامنے پہاڑی کے عقب سے کہیں دو درندہ دوق کے دھماکے سنائی دیئے۔ وہ جلدی سے گھوڑوں پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ پہاڑی کی چوٹی سے تھوڑی دور ادھر معظم علی نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو رکنے کے لیے کہا اور خود گھوڑے سے اتر کر جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا۔ اب اسے بند دوق کی آواز کے علاوہ عورتوں اور بچوں کی چیخ دیکھ کر بھی سنائی دے رہی تھی۔ چوٹی پر پہنچ کر اسے ایک تنگ وادی دکھائی دی۔ وادی کے دائیں طرف ایک پہاڑی کے دامن میں قریباً اڑھائی سو آدمیوں کا ایک قافلہ مرہٹوں کے گھیرے میں آچکا تھا۔ قافلے کے محافظ اور حمد آدر پتھر دھن اور درختوں کی آڑ سے ایک دوسرے پر گولیاں برس رہے تھے۔ معظم علی نے

عمر سیدہ آدمی نے جواب دیا: مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ کے لوگ نے ابھی مجھے ان کے گھر کی تباہی کے واقعات سنائے ہیں۔ اگر ان کے بال بچے آپ کو مکھنوں میں نہیں ملے تو آپ کو حیدرآباد جانا چاہیے۔

معظم علی نے کہا: "مرزا صاحب کے ماموں زاد بھائی مکھنوں سے ہجرت کر کے حیدرآباد جا چکے ہیں۔ لیکن ہے کہ مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی مکھنوں میں ان کا پتہ کرنے کے بعد حیدرآباد چلی گئی ہوں لیکن میں نے سنا تھا کہ مرزا صاحب کے کئی عزیز دلی میں بھی ہیں۔ آپ کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتے جو زیادہ قریبی ہو لیکن ہے وہ یہاں آئے ہوں۔" عمر سیدہ آدمی نے جواب دیا: "یہاں مرزا صاحب کے خالو کے دو لڑکے رہتے تھے۔ بڑے کا نام عبدالجبار تھا اور چھوٹے کا نام عبدالکریم تھا۔ عبدالجبار کوئی چار سال قبل فوت ہو گیا تھا اور عبدالکریم اور اس کے خاندان کے باقی افراد ہجرت کر کے دکن چلے گئے تھے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ دکن میں وہ کہاں رہتے ہیں۔ بہر حال حیدرآباد سے یقیناً آپ کو ان کا سراغ مل جائے گا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک آپ یہاں ہیں اس سرائے کی بجائے میرے پاس ٹھہریں۔"

معظم علی نے کہا: "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں لیکن اب میرے یہاں ٹھہرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں انشاء اللہ کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔"

اگلی صبح دلی سے روانہ ہوتے وقت معظم علی نے لال قلعے کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دعا کی: "مولائے کریم! میری قوم کی بے بسی تیری رحمت کو پکار رہی ہے۔ ہمیں ان افواج کی بدامنیوں کی مرزا دے جن کی چیزہ دستیوں کے باعث ہماری عزت و آزادی کے پرچم ایک ایک کر کے سرنگوں ہو رہے ہیں۔ لال قلعہ کی دیواریں اس دلِ عظیم کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ جو ہماری عزت اور بقا کے دشمنوں سے رخنہ کی ہمت رکھتا ہو۔ یہ باؤسی اور بے بسی ہماری میراث ہے اور آج ہمیں ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے۔"

بندرتیں پھینک کر تواریں نکال لیں اور ان کا پھینکا کرنے لگے۔ پندرہ منٹ کے اندر میدان خالی ہو چکا تھا اور مرہٹے وادی کے نشیب کے گھنے جنگل میں روپوش ہو چکے تھے۔ اکبر خاں اپنے ساتھیوں کو گھوڑے لانے کا حکم دے کر بھاگتا ہوا معظم علی کے پاس پہنچا۔ قافلے کے محافظ اب اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ معظم علی کچھ دیر ان کے ساتھ بائیں کمرے کے بعد قافلے کے پڑاؤ کی طرف بڑھا۔ چند قدم پر سرخ و سفید رنگ کا ایک ادھیڑ عمر آدمی ایک پتھر کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "متوڑی دیر پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ خدا اگر ہمیں ان ظالموں سے بچانا چاہتا ہے تو وہ ہماری مدد کے لیے آسمان سے فرشتے بھیج سکتا ہے اگر آپ فرشتے نہیں تو میں آپ سے متعارف ہونا چاہتا ہوں۔ میرا نام فخر الدین ہے اور میں اس قافلے کے ساتھ حیدر آباد جا رہا تھا۔"

معظم علی نے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "میرا نام معظم علی ہے اور یہ میرے دوست اکبر خاں ہیں اور ہماری منزل بھی حیدر آباد ہے۔ ہمیں انوس ہے کہ ہر وقت پتہ پہنچ سکے ورنہ اتنی جائیں ضائع نہ ہوتیں۔"

فخر الدین نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا: "تم شہیدوں کی قبریں کھودنے کا انتظام کرو اور زخمیوں کو ایک جگہ جمع کر دو۔ پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ کے باقی آدمی کہاں ہیں؟"

"وہ اس پہاڑی کے پیچے اپنے گھوڑے لینے گئے ہیں۔"

قافلے کی عورتیں اور بچے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ دوڑکیاں جھاڑیوں سے باہر نکلیں اور بھاگتی ہوئی فخر الدین کی طرف بڑھیں۔ بڑی لڑکی جس کے ہاتھ میں بندوق تھی فخر الدین کے ساتھ دو اجنبی دیکھ کر چند قدم کے فاصلے پر رک گئی اور دوسری جس کی عمر بارہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوئی تھی "ماہوں جان"

زمین پر بیٹ کر صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ حملہ آوروں کی تعداد ایک سو سے زیادہ نہ تھی لیکن قافلے کی طرف سے لڑنے والے بہت کم معلوم ہوتے تھے۔ معظم علی مرکز بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور اس نے کہا: "اس پہاڑی کے نیچے وادی میں ایک قافلہ گھرا ہوا ہے، تم میں سے دو آدمی گھوڑوں کے پاس رہیں۔ اکبر خاں تم آٹھ آدمیوں کے ساتھ اس چوٹی سے ذرا نیچے پتھروں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپے رہو۔ میں باقی آدمیوں کے ساتھ دائیں طرف سے چکر کاٹ کر دوسری پہاڑی پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بندی سے ہماری گولیاں حملہ آوروں کے لیے کافی پریشان کن ثابت ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ مرہٹے بدحواسی کی حالت میں پیچھے ہٹیں گے لیکن تمہاری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ اس پہاڑی کی طرف نہ آسکیں۔ تمہاری گولیوں سے پریشان ہو کر اگر وہ وادی کی بائیں طرف پسپا ہونے کی کوشش کریں تو سمجھ لینا کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے۔ اگر تم نے انھیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ہماری تعداد بہت کم ہے تو ممکن ہے کہ وہ چند منٹ کے اندر اندر پسپا ہو جائیں اور یہی میں چاہتا ہوں۔"

قریباً ایک گھنٹہ کے بعد قافلے کے ساتھ آدمی ہلاک اور گیارہ زخمی ہو چکے تھے اور مرہٹے ان پر ایک فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہے تھے، اچانک ان کے عقب میں پہاڑی کی چوٹی سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور سات آدمی گر پڑے۔ مرہٹے بدحواس ہو کر پیچھے ہٹنے لگے۔ پھر دوسری پہاڑی کے دامن سے اکبر خاں اور اس کے ساتھیوں نے گولیاں چلائیں اور چھ آدمی اور ڈھیر ہو گئے۔ مرہٹے اپنے دونوں طرف پہاڑیوں کو خطرناک سمجھ کر وادی کے درمیان سمٹنے لگے۔ قافلے کے محافظ حیران ہو کر اپنے دائیں اور بائیں دونوں پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور بلند آواز میں چلایا: "تم کیا دیکھ رہے ہو، اب حملہ کا وقت ہے۔ دشمن پسپا ہو رہا ہے۔ قافلے کے می فٹوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا اور دشمن پراندا دھندنا رنگ شروع کر دی۔ پھر چند آدمیوں نے

ہاموں جان !! کہتی ہوئی آگے بڑھی اور بے اختیار فخر الدین کے ساتھ لپٹ کر سکیا
لینے لگی۔ معظم علی نے بڑی لڑکی کی طرف دیکھا اور وہ بڑا اس ہو کر اپنا نقاب درست کرنے لگی
معظم علی نے دوبارہ اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ کی تاہم چند تانیے ایک حسین
اور دلکش تصویر اس کی نظروں کے سامنے بھرتی رہی۔

فخر الدین نے چھوٹی لڑکی سے کہا: "بلقیس! بیٹی جاؤ اپنی ماں کے پاس بیٹھو اور
عطیہ کو سبھی تسلی دکر اب کوئی خطرہ نہیں۔ خدا نے ہمارے مدد کے لیے فرشتے بھیج
دیئے ہیں۔"

"فرشتے؟" بلقیس نے حیران سی ہو کر کہا۔ "فرشتے کہاں ہیں؟"
فخر الدین نے مسکرا کر معظم علی اور اکبر خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب
دیا۔ "یہ فرشتے نہیں تو اور کیا ہیں؟"

بلقیس نے حیران اور شکر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کی طرف دیکھا
اور اس کی نگاہیں اکبر خاں کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اکبر خاں اسے سچ ایک
فرشتہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنی بہن کی طرف بڑھی اور فخر الدین نے معظم علی
کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "یہ میری بھانجیاں ہیں۔ ان کا آپ ذات ہو چکا ہے۔ ان میں نہیں
دلی سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ان دونوں دلی میں داخل ہونا معمولی بات نہیں لیکن خوش قسمتی
سے پونا کے ایک ہندو تاجر کے ساتھ میرے کاروباری تعلقات تھے اور اس نے مرہٹہ
حکومت سے میرے لیے پرواز راہ داری حاصل کر کے میرے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ ہماری
خوش قسمتی تھی کہ دلی سے واپسی پر راستے میں ہمیں یہ توفیق مل گیا۔ یہ لوگ شمال کے شہروں
سے تلاش روزگار کے لیے حیدرآباد جا رہے تھے۔ چلیے زنجیوں کو دیکھیں؟"

معظم علی شام سے پہلے ایک منزل اور طے کرنا چاہتا تھا لیکن قافلے کی حفاظت
کے خیال سے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

رات قدرے خشک تھی۔ غبار کی ناز کے بعد قافلے کے پڑاؤ میں جگہ جگہ لالہ جل
رہے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ان کے گرد جمع تھے۔ چند سلاخ
آدی پڑاؤ کے گرد پھر دے رہے تھے۔ عطیہ، بلقیس اور ان کی ماں ایک چھوٹے سے
خیمے کے اندر بیٹھی ہوئی تھیں اور خیمے سے چند قدم دور فخر الدین، معظم علی، اکبر خاں اور
چند آدمی ایک الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک آدمی نے کہا: "حیدرآباد پہنچ کر ان مٹیوں اور ہواؤں کا کیا بنے گا جن کے
سرپرست لڑائی میں مارے جا چکے ہیں؟ ہم سب کو مل کر ان کا بوجھ اٹھانا چاہیے؟"
فخر الدین نے کہا: "آپ میں سے کسی کو ان کا بوجھ اٹھانے کی ضرورت نہیں
حیدرآباد میں ان کی دیکھ بھال میرے ذمہ ہوگی۔"

فخر الدین سے چند سوالات پوچھنے پر معظم علی کو معلوم ہوا کہ وہ ایرانی تاجروں
کے ایک ہائڈراؤر متول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور چند سال قبل دلی سے ہجرت کر
کے حیدرآباد دکن میں آیا ہو چکا ہے اور اس کا تجارتی کاروبار دکن سے میسور اور کرنٹک
تک پھیلا ہوا ہے۔

جب معظم علی نے فخر الدین کے سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگذشت
بیان کی تو وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "آپ پریشان
نہیں۔ اگر آپ کے عزیز حیدرآباد میں ہیں تو میں وہاں پہنچنے ہی ان کا یہ کر دوں گا۔ جیسا
میں آپ میرے مہمان ہوں گے۔"

مقتوری دیر بعد چند آدمی الاؤ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس پہلے گئے
اور باقی وہی الاؤ کے قریب سو گئے۔ فخر الدین دیر تک معظم علی سے بات کرتا رہا۔ پھر
بنگال کے حالات زیر بحث آئے اور معظم علی نے میر جعفر کی کٹھ پتلی حکومت کے

متعلق اپنے آثارات بیان کیے اس کے بعد اودھ، روہیلکھنڈ اور دہلی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ بلاخر دکن کا ذکر کیا اور خیر الدین نے کہا: "دکن ان دنوں شمال اور مشرق سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی آخری جائے پناہ ہے۔ دہلی کی قدیم شان و شوکت اب آپ کو حیدرآباد میں دکھائی دے گی لیکن میں دکن کے مستقبل کے متعلق زیادہ پر امید نہیں بلکہ ناامید کی طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں کا اثر و رسوخ اب دکن کے دربار میں بھی پہنچ چکا ہے۔ دوسری طرف مرہٹے بڑی تیزی سے منظم ہو رہے ہیں اور وہ صرف دکن پر ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہر دینی خطرات کا سامنا کرنے کے لیے دکن کے پاس وسائل کی کمی نہیں لیکن نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد گزشتہ چند سال میں اس کے بیٹوں کی خانہ جنگی نے مسلمانوں کے اس عظیم دفاعی حصار کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اس وقت یہ کشمکش ہے کہ دکن کی عملاتی سازشوں کا بلاخر نتیجہ کیا ہوگا لیکن میں جس شخص کی کامیابی سے ڈرتا ہوں وہ میر نظام علی ہے۔ اس نے اپنے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ لڑایا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ جس دن دکن کی حکومت اس کے ہاتھ میں آئے گی وہ قوم کے لیے بنگال کے میر جعفر اور کرناٹک کے محمد علی والا جاہ سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ وہ انگریزوں کی طرف بہت زیادہ مائل ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں جنوب کے مسلمانوں کے مستقبل سے بالکل مایوس بھی نہیں ہوں۔ ہمارے پڑوس میں ایک نئی طاقت ابھر رہی ہے۔ اگر میرے اندازے غلط نہیں تو ہم بہت جلد گیرڈوں اور بھیڑیوں کی شکار ہوگا ہوں میں ایک شیر کی گرج سنیں گے۔ میں ایک ایسے آدمی سے مل چکا ہوں جو ایک بیدار مغز سیاستدان بھی ہے اور ایک اولوالعزم سیاسی بھی!"

اکبر خان، جو معظم علی کے قریب بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اچانک چونک اٹھا۔ "جی وہ کون ہے؟"

"آپ اسے نہیں جانتے لیکن اگر وہ چند برس زندہ رہا اور قدرت نے اس کی مدد کی تو وہ جنوب کے مسلمانوں کا آخری محافظ ثابت ہوگا۔ اس کا نام حیدر علی ہے اور اس وقت وہ میسور کی فوج کا ایک افسر ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب انگریز اور مرہٹے اسے اپنا ایک طاقت ور اور خطرناک حریف سمجھیں گے۔ ابھی جب آپ مجھے بنگال میں اپنی سپاہیانہ زندگی کے واقعات سن رہے تھے تو میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی دن آپ کی آخری منزل میسور ہوگی۔ میں اس سے دوبارہ مل چکا ہوں اور یقین کیجئے کہ میں اپنی زندگی میں کسی اور شخصیت سے اتنا متاثر نہیں ہوا۔ آپ کی طرح وہ ان طالع آزمائوں کو شک کا بدترین سمجھتا ہے جو انگریزوں کے ساتھ اپنا سیاسی مستقبل وابستہ کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "اگر اس کے علاوہ اس قدر بلند ہیں تو ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ خدا اسے ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے جو اپنے ہر من کا سر کاٹ کر دشمن کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

پاس ہی خیمے کے اندر عطیہ، بلقیس اور ان کی ماں دن بھر کے واقعات پر توجہ کر رہی تھیں عطیہ نے کہا: "امی جان! ماموں جان ساری رات باہر بیٹھے رہیں گے؟"

وہ آجائیں گے بیٹی۔ تم اب سو جاؤ!"

بلقیس نے ذرا آگے سر کر عطیہ کے کان میں کہا: "آپا جان آپ نے فرشتے دیکھے ہیں؟"

نہیں۔ لیکن تمہیں اس وقت بیٹھے بیٹھے فرشتوں کا خیال کیسے آیا؟

اس لیے کہ میں نے آج فرشتے دیکھے ہیں۔ دو فرشتے۔ ایک بڑا تھا اور ایک چھوٹا اور اس وقت وہ ماموں جان کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ دیکھیے اُدھر! یہ کہتے ہوئے بلقیس نے خیمے کے دروازے کا پردہ اٹھا دیا۔

ماں نے کہا: "پگلی اب آرام سے سو جاؤ۔ انہوں نے ہماری جان بچائی ہے اور"

تم ان کا مذاق اڑا رہی ہو۔

”میں مذاق نہیں کرتی امتی جان! ماموں جان کہتے تھے وہ فرشتے ہیں۔“
”انہوں نے بالکل درست کہا۔ اگر یہ لوگ خدا کی رحمت کے فرشتے بن کر نہ آتے تو اس وقت ہماری لاشیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔“



اگلے صبح یہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔ کوئی چار کوس چلنے کے بعد یہ لوگ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئے۔ چند زخمی گھوڑوں پر سفر کرنے کے قابل نہ تھے۔ فخر الدین کی درخواست پر گاؤں کے زمیندار نے معقول کرائے پر سات میل گاڑیاں میا کر دیں۔ زخموں کے علاوہ قافلے کی چند عورتیں اور بچے جو گھوڑوں پر طویل سفر کرنے سے تنگ آ چکے تھے، میل گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ ایک گاڑی میں فخر الدین کی بہن اور بھانجیاں بیٹھ گئیں۔ گاؤں کے لوگوں سے استفسار پر معظم علی کو یہ معلوم ہوا کہ مرہٹہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں یہ لوگ کہیں باہر سے آئے ہیں اور دو دن قبل اس گاؤں سے دس کوس شمال کی طرف ایک چھوٹے سے شہر کو لوٹ چکے ہیں۔ اگلے منزل پر ایک زخمی نے جس کی حالت بہت نازک تھی دم توڑ دیا۔ اس کے دو دن بعد ایک اور زخمی چل بسا۔

حیدر آباد پہنچتے پہنچتے معظم علی قافلے کے ہر بچے اور بوڑھے کی نگاہ میں ایک بڑے بن چکا تھا۔ مسلح آدمی اسے اپنا کمانڈر تصور کرتے تھے۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے وہ ایک سعادت مند بیٹا اور نوجوانوں اور کس بچوں کے لیے وہ ایک شوق بھائی بن چکا تھا۔ بلقیس کبھی کبھی گاڑی کا پردہ سرک کر اکبر کی طرف دیکھتی اور عطیہ کے کان میں کہتی: ”اپا جان وہ یقیناً کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔“ کبھی کبھی وہ پیدل چلنے کے بہانے گاڑی سے کود پڑتی اور پھر تھوڑی دیر بھاگنے کے بعد فخر الدین سے کبھی ماموں جان

میں گھوڑے پر سواری کروں گی اور فخر الدین کے ذکر اسے گھوڑے پر سوار کرادیتے۔ پھر وہ اکبر خاں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی بات کرتی۔ حیدر آباد بھی یہاں سے کتنی دور ہے؟ آپ نے ہمایوں کا مزار دیکھا ہے؟ لال قلعہ اور جامع مسجد دیکھی ہے؟ ماموں جان کہتے تھے کہ آپ شیر کا شکار کھیلا کرتے ہیں۔ کبھی آپ نے ہتھی بھی مارا ہے؟ ایک دن اس نے بڑے بھولے پن سے کہا: ”بھلا یہ درست ہے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟“

اکبر خاں اس سوال پر ہنس پڑا اور بقیس کا مصوم چہرہ حیا سے تمٹا اٹھا۔ ”کیا بات ہے اکبر؟“ معظم علی نے اپنا گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ پوچھتی ہے میں شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں؟“ معظم علی نے کہا: ”اس میں اس کا تصور نہیں۔“ آجکل دلی کا ہر شہر آدمی یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

بقیس کو اکبر خاں کی ہنسی اور اس سے زیادہ معظم علی کی مداخلت پسند نہ آئی اور اس نے مڑ کر ایک نوکر کو آواز دی۔ ”یہ گھوڑا سنبھالو میں گاڑی پر چاٹی ہوں۔“

جب وہ گھوڑے سے اتار کر گاڑی پر سوار ہو رہی تھی تو عطیہ نے بڑبڑا کر کہا: ”بس گھوڑے کی سواری کا شوق پورا ہو گیا؟“

بقیس کچھ دیر مزہ سورا کر بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے کہا: ”اپا جان وہ دونوں گنوار ہیں۔“ عطیہ ہنس پڑی لیکن ماں نے ڈانٹ کر کہا: ”بڑی بد زبان ہو تم!“ تھوڑی دیر بعد عطیہ نے اس کے کان میں کہا: ”چریل سچ بتا دیا کہ اچھا تھا تم نے اس سے؟“

”میں نے اسے کیا کہا تھا!“

”اچھا تمہارے بادشاہ سلامت کو بلا کر یہ کہوں کہ مگر عالیہ خفا ہو کر سیل گاڑی پر

سوا نہ ہو گئی ہیں۔

”امی جان! بھیس نے احتجاج کے لمحے میں کہا: ”اپا جان مجھے گالیاں دیتی ہیں۔“
ماں نے کہا: ”عطیہ چھوڑو اسے تنگ نہ کرو۔“



حیدر آباد پہنچ کر معظّم علی نے فخر الدین کی جوشانِ شوکت دیکھی وہ اس کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ دو منزلہ رہائشی مکان کے ساتھ اس کا ہمان خانہ اس قدر وسیع تھا کہ وہاں بیک وقت سو مہمان ٹھہر سکتے تھے۔ ہمان خانے کے ساتھ اس کا وسیع دفتر تھا جہاں آٹھ دس منشی کام کرتے تھے۔ وہ گھوڑوں اور ہاتھیوں کے علاوہ اسلحہ، بارود، ریشم، صندل اور گرم سالے کی تجارت کرتا تھا۔ گلی کی دوسری طرف ایک وسیع حویلی میں اصطبل اور گودام تھے۔ جب یہ قافلہ حیدر آباد پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ فخر الدین کا ایک نوکر چند گھنٹے پہلے گھر پہنچ کر اس کی آمد کی اطلاع دے چکا تھا۔ اس کے نوکر ہمان خانے کی بجلی منزل میں قافلے کے لادارت بچوں، عورتوں اور بے سہارا آدمیوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر چکے تھے۔ معظّم علی اور اکبر خاں کو بالائی منزل میں جگہ دی گئی اور ان کے نوکر فخر الدین کے نوکروں کے ساتھ دوسری حویلی میں چلے گئے۔ قافلے کے باقی لوگ حیدر آباد میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو رخصت ہو چکے تھے۔

رات کے وقت اپنے مہمانوں کو کھانا کھلانے کے بعد فخر الدین نے معظّم علی سے کہا: ”اب آپ آرام سے سو جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علی الصباح آپ میرے علاوہ جس دوسرے آدمی کو پہلے دیکھیں گے، وہ مرزا حسین بیگ کا کوئی رشتہ دار ہوگا۔“
معظّم علی نے کہا: ”لیکن حیدر آباد بہت بڑا شہر ہے۔ آپ اتنی جلدی کیسے پتہ لگا لیں گے؟“

فخر الدین نے جواب دیا: ”آپ اطمینان رکھیں۔ میرے پاس ڈیڑھ سو نوکر ہیں اس

کے علاوہ میں ابھی شہر کے کووال اور فوج کے چیدہ چیدہ افسروں کے پاس چلتا ہوں، اگر مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار حیدر آباد میں ہیں تو انہیں تلاش کرنے کے لیے ایک رات کافی ہے۔“

تھکاوٹ سے چور ہونے کے باوجود معظّم علی کو دیر تک نیند نہ آئی۔ پھر صبح جب اس کی نیند کھلی تو سورج کافی اوپر اچکا تھا۔ کمرے میں دوسرے لیٹر پر اکبر خاں ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ لباس تبدیل کر کے کمرے سے باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ فخر الدین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: ”مرزا حسین بیگ کے رشتہ دار مل گئے ہیں وہ صبح ہوتے ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے بھی ہیں۔ آپ گہری نیند سو رہے تھے، میں نے جگنا مناسب نہ خیال کیا۔ اب چلیے وہ نیچے ٹیبلک میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“
”میری نیند اس قدر اہم نہ تھی۔“ معظّم علی نے شکایت کے لمحے میں کہا: ”انہوں نے آپ کو کیا بتایا ہے؟“

فخر الدین نے معظّم علی کے جواب دیا: ”انہیں مرزا حسین بیگ کے بچوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

معظّم علی ایک ٹانہ کے لیے لٹے ہوئے مساذ کی طرح فخر الدین کی طرف دیکھتا رہا۔
مجھے افسوس ہے۔“ فخر الدین نے کہا: ”چلیے!“

معظّم علی، فخر الدین کے ساتھ نیچے اتر کر ایک وسیع کمرے میں داخل ہوا۔ تین عمر رسیدہ آدمی اور پانچ جوان قایلین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ معظّم علی کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ معظّم علی نے یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور ان کے سامنے قایلین پر بیٹھے ہوئے کہا: ”میرا خیال تھا کہ مرزا حسین بیگ کے بیٹے حیدر آباد پہنچ گئے ہوں گے۔ مرشد آباد چھوڑنے کے بعد وہ کھنڈکی طرف روانہ ہوئے تھے۔ میں ان کی تلاش میں لکھنؤ پہنچا تو وہاں سے ان کے رشتہ دار ہجرت کر چکے تھے۔ مرزا صاحب کے متعلق مجھے کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ میں

فیض آباد، اگر وہ دہلی کے علاوہ کسی اور شہروں میں انھیں تلاش کر چکا ہوں۔
ایک عمر رسیدہ آدمی نے کہا: لکھنؤ میں ان کا رشتہ دار میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں
مرزا صاحب کا ماموں زاد بھائی ہوں لیکن برہمنی سے میں پلاسی کی جنگ سے پہلے لکھنؤ
چھوڑ کر یہاں آچکا تھا۔

معظم علی نے پوچھا: آپ ارشد بیگ ہیں؟

جی ہاں۔

آپ میں سے عبدالکریم کون ہیں؟

دوسرے آدمی نے جواب دیا: میں ہوں لیکن مجھے بھی مرزا حسین بیگ کی بیوی
اور لڑکی کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں آتے اور ہمیں نہ ملے۔
تیسرے آدمی نے معظم علی سے سوال کیا: آپ محمود علی خاں کے بیٹے ہیں؟

جی ہاں۔ معظم علی نے معلوم بھی میں جواب دیا۔

اس نے کہا: میں شوکت بیگ کا باپ ہوں۔

معظم علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوال کیا: آپ یہاں کب آئے؟
مجھے پلاسی کی جنگ سے چند ہفتے بعد ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ میں نے بنگال چھوڑنے
وقت مرشد آباد میں مرزا حسین بیگ کا پتہ کیا تھا لیکن وہ مجھ سے پہلے ہجرت کر چکے تھے۔
میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ لکھنؤ پہنچ گئے ہوں گے اور وہاں جا کر بھی میں نے انھیں
تلاش کیا تھا۔

معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: اور میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ڈھاکہ
جا کر ان کو پتہ کروں گا۔

مرزا حسین بیگ کے رشتہ داروں سے ملنے کے بعد معظم علی کی حالت اس ساڈکی

سی تھی جس کے سامنے کوئی منزل یا راستہ نہ ہو۔ اسے حیدر آباد کی پردہ پوشیوں اور بازار سنان
نظر آتے تھے۔ فخر الدین، مرزا حسین بیگ کی بیوی اور صاحبزادی کا پتہ دینے والے کو پانچ سو
اشرافیاں انعام دینے کا اعلان کر چکا تھا اور شہر میں منادی کرنے والے لگی لگی گھوم رہے تھے
لیکن فخریت اور اس کی ماں کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اکبر خاں کے لیے حیدر آباد کا پردہ پوشی شہر ایک بہت بڑا عجائب گھر تھا۔ وہ صبح سویرے
اٹھتا اور کسی نوکر کو ساتھ لے کر باہر نکل جاتا۔ اسے حیدر آباد کی فوجی تربیت گاہ میں نوجوان
افسروں کی نیزہ بازی، شہسواری اور چوگان کے کھیل بہت پسند تھے۔ کبھی وہ فخر الدین کے
اصطبل میں جاتا اور کسی شوخ اور تند گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کے لیے چلا جاتا۔ اسے معظم علی کے
ریج وکرب کا بڑی شدت کے ساتھ احساس تھا اور وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کیا کرتا
تھا لیکن معظم علی کے ساتھ بیکار بیٹھنا اس کے پس کی بات نہ تھی۔ وہ اکثر یہ کہتا: بھائی جان
آج فلاں جگہ نیزہ بازی ہو رہی ہے، آج فلاں میدان میں فوج کے افسر چوگان کھیل رہے
ہیں۔ آج فخر الدین کے اصطبل میں چند نئے گھوڑے آئے ہیں، چلیے آپ کو دکھاتا ہوں!

معظم علی کبھی بھی دل پر جبر کر کے اس کا ساتھ دیتا لیکن عام طور پر اس کا یہی جواب
ہوتا: اکبر تم جاؤ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔



ایک دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اکبر خاں کہیں باہر گیا ہوا تھا اور معظم علی
اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے سامنے طویل برآمدے کا ایک سرا رانچی
مکان سے ملا ہوا تھا، اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور معظم علی کمرے سے ایک
کری نکال کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دائیں ہاتھ برآمدے کے کونے پر ایک دروازہ کھلا اور بقیس جھکوت
شرمائی ہوئی آگے بڑھی۔

لکھو میں آپ کے رشتہ دار ہوں گے؟ بلقیس نے کہا۔
نہیں۔

بلقیس نے صحن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ماموں جان اگئے!"
معظم علی نے صحن کی طرف دیکھا۔ فخر الدین ایک پیرن اٹھائے بیڑھیوں کی طرف
بڑھ رہا تھا۔ معظم علی اٹھ کر کمرے سے دوسری کرسی نکال لایا۔ فخر الدین اور بیسپنا تو بلقیس کو
سے چلی گئی۔

فخر الدین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: اکبر خاں کہاں ہے؟
"جی وہ بارش سے تھوڑی دیر پہلے باہر نکل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آپ کے صطبل
میں گھوڑے دیکھ رہا ہوگا۔"

"اے گھوڑوں کا بہت شوق ہے میں اسے عربی نسل کا ایک بہترین جوڑا دینا چاہتا
ہوں۔ بڑا ہونسا لڑکا ہے۔ اگر آپ اسے میرے پاس چھوڑ دیں تو میں اسے چند برس میں
ایک کامیاب تاجر بنا سکتا ہوں۔ اسے گھوڑوں کی تجارت کا شوق بھی ہے۔"
"یہ شوق اسے اپنے باپ سے ملا ہے۔"

فخر الدین نے قہقہے توہن کے بعد کہا۔ "میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا
چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے۔"

فخر الدین نے تھوڑی دیر گزرنے کے بعد کہا۔ "مجھے انوس ہے کہ میں
حیدرآباد میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ آپ کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ کسی غم میں گھلے جا
رہے ہیں۔ آپ ان نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں قدرت نے پہاڑوں کے سینے چرنے کی
ہمت عطا کی ہے۔ زندگی سے آپ کی یہ بیزاری بڑی انوسناک ہے۔ میں ابھی سپہ سالار
سے مل کر آ رہا ہوں۔ میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تھا اور انہوں نے آپ کی سرگزشت

آؤ بلقیس! "معظم علی نے اس کی طرف دیکھ کر پیاسے کہا۔ "میں نے تمہیں
کل سے نہیں دیکھا۔ کہاں غائب تھیں تم؟
بلقیس نے جواب دیا۔ "کل آپا جان کو بخار تھا اور میں ان کے پاس تھی۔"
اب کیسی ہیں وہ؟

اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ امی جان پوچھتی ہیں، آپ کی طبیعت ٹھیک
ہے نا؟

ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔

ماموں جان کہتے تھے کہ آپ یہاں سے بہت جلد چلے جائیں گے؟

ہاں! میرا ارادہ ہے کہ میں اگلے ہفتے یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔

نہیں آپ نہ جائیں! بلقیس نے مزہ لے کر کہا۔ "اگر آپ یہاں ٹھہریں تو آپ
کے رشتہ داروں کو مل جائیں گے۔ میں ہر روز یہ دعا کیا کرتی ہوں کہ آپ کے رشتہ دار آپ
کو مل جائیں۔ امی جان اور آپا جان بھی آپ کے لیے دعا کیا کرتی ہیں اور میں یہی دعا کیا
کرتی ہوں کہ آپ یہیں رہیں۔"

معظم علی مسکرایا۔ "بلقیس تم بہت اچھی لڑکی ہو لیکن میرے لیے حیدرآباد ٹھہرنے
کی دعا نہ کرو۔"

"کیوں آپ کو حیدرآباد پسند نہیں ہے؟"

حیدرآباد بہت اچھا شہر ہے لیکن میں یہاں ایک مسافر ہوں۔

بلقیس نے مایوس ہو کر کہا۔ "آپ کو گھر یاد آئے ہوگا؟"

میرا کوئی گھر نہیں۔ معظم علی نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ یہاں کیوں نہیں رہتے؟"

"میں لکھنؤ جانا چاہتا ہوں۔"

سننے کے بعد یہ کہا تھا کہ اگر ایسا نوجوان حیدرآباد کی فوج میں شامل ہونا پسند کرے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ وہ آپ کو بہترین عہدہ دینے کے لیے تیار ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہاں آپ کا مستقبل بہت روشن ہوگا اور آپ اپنی اداس اور مغموم زندگی میں نئی دلچسپیاں تلاش کر سکیں گے۔

معظم علی نے جواب دیا: زندگی کے ساتھ میری دلچسپیاں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں لیکن یہ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ میں آئندہ فوج کی ملازمت نہیں کروں گا، میرے لیے اپنے ان عزیزوں اور دوستوں کی بے مقصد قربانیوں کی یاد کافی ہے جن کا خون بنگال کی خاک میں جذب ہو چکا ہے۔

فخر الدین نے پھر تھوڑی دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا: یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوتی ہے اور شاید آپ کو بھی عجیب معلوم ہو لیکن ہم جس دور سے گزر رہے ہیں۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے قدیم رسم و رواج کی دیواریں توڑ رہا ہے۔ میری اور مجھ سے زیادہ میری ہمیشہ کی یہ خواہش ہے کہ آپ کو ان کی بڑی لڑکی کا شریک حیات بنا دیا جائے اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ نے ہماری جانیں بچائی ہیں بلکہ اس لیے کہ میں اپنی یتیم بھانجی کے لیے آپ جیسا نیک اور قابل اعتماد رفیق حیات تلاش کر لینا قدرت کا ایک انعام سمجھتا ہوں اور اپنی بھانجی کے متعلق اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک نیک ماں اور شریفیت باپ کی بیٹی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ میں اس کے لیے کسی ریاست کے مالک کا دروازہ کھٹکھٹا سکوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اسے اپنے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ آپ جیسے سلیم الغفلت انسان کے ساتھ ایک جھوپڑے میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے گی۔

معظم علی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے فخر الدین کی طرٹ دیکھا اور ابدیدہ ہو کر کہا: میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے روتے زمین کے تمام پہاڑ اٹھا کر

میری گردن پر رکھ دیئے ہیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یہ دنیا آج بھی فرشتوں کے وجود سے خالی نہیں لیکن میں اس مسئلے میں بے بس ہوں اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زبان سے انتہائی دیانت دارانہ جواب بھی شرافت اور انسانیت کا مزہ نوچنے کے مترادف ہوگا۔ میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں: یہ چند برس کی بات ہے۔ میرا ایک دوست جو مجھے بھائی کی طرح عزیز تھا، لڑائی میں زخمی ہونے کے بعد میری گود میں سر رکھ کر دم توڑ رہا تھا۔ اس دنیا میں اسے اپنی ایک بہن سب سے زیادہ عزیز تھی اور اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ میں اس کے مستقبل کا امین بنوں۔ مجھے یہ بتانے میں کوئی تامل نہیں کہ میں اس لڑکی کو جانتا تھا۔ میں اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ گڑیا کے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کے بھائی کی آخری خواہش پوری ہوگی لیکن کچھ عرصہ بعد میں گرفتار اور پھر مرہٹوں کی قید سے نکل کر گھر پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اس کے بعد دنیا میرے لیے تاریک ہو چکی تھی، پھر ایک دن ایسا ہوا جب میں اور اس لڑکی کا منگیترا ایک ہی محاذ پر مرہٹوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ وہ مجھ سے کسی بات میں کم نہ تھا اور ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست بن چکے تھے۔ میں اس لڑکی کی خاطر اس کے ہونے والے شوہر کے لیے اپنے دل میں ایک بھائی کی شفقت محسوس کرتا تھا۔ یہ نوجوان ایک لڑائی میں مارا گیا۔ پھر ہمارے والدین ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے ہی تھے کہ بنگال میں انقلاب آگیا۔

فخر الدین نے ممتا سے ہو کر کہا اور وہ لڑکی مرزا حسین بیگ کی بیٹی تھی؟

جی ہاں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ آپ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

تھوڑی دیر بعد فخر الدین اٹھ کر زنا خانے میں چلا گیا اور معظم علی دیر تک وہیں

بیٹھا رہا۔ معظم علی نے عطیہ کو صرف ایک بار اور وہ بھی دور سے دیکھا تھا تاہم اس کی معمولی جھلک بھی کسی نوجوان کے دل کی دھڑکنیں تیز کرنے کے لیے کافی تھی لیکن معظم علی کے پہلو میں وہ دل نہ تھا۔ عطیہ بہت کچھ تھی لیکن وہ فرحت نہ تھی۔
 ”فرحت! فرحت!!“ وہ اپنے تصور میں اسے آوازیں دیتا ہوا اٹھا اور کمرے کے اندر جا کر بستر پر گر پڑا۔ ”فرحت! فرحت!! تم کہاں ہو؟ کاش میری آواز تمہارے کان تک پہنچ سکتی!“

اگلے روز رات کے وقت معظم علی اور اکبر خاں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، فخر الدین اندر داخل ہوا اور ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”معظم علی! حیدر آباد کی فوج میں ملازمت کے متعلق تم میری تجویز رد کر چکے ہو لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمہیں بریکار بیٹھ کر چین نصیب نہیں ہوگا۔ اگر تم تجارت شروع کرنا چاہو تو میں تمہیں اور اکبر خاں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ شریک ہونا پسند نہیں کرتے تو میں تمہیں بڑی خوشی سے قرض حسنہ کے طور پر ایک معقول رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم جب چاہو مجھے واپس کر دینا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی کام میں تمہارا جی لگ جائے۔“
 معظم علی نے جواب دیا۔ ”تجارت کے متعلق میں بھی چند دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں یہیں سے ابتدا کر دوں اور کھنٹو جاتے ہوئے اپنے ساتھ چند گھوڑے لیتا جاؤں اور سرائے کے لیے میں آپ کو تکلیف دینا پسند نہیں کروں گا۔“

”لیکن سرائے کے بغیر تو تجارت نہیں ہوتی۔“

”سراپہ میرے پاس کافی ہے۔“ معظم علی نے یہ کہتے ہوئے اپنی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر کمرے کے ساتھ بندھی ہوئی پٹیلی نکالی اور اس میں سے ایک ہیرا نکال کر فخر الدین کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے خیال میں اس کی قیمت کیا ہوگی؟“
 فخر الدین نے چراغ کی روشنی میں میرے کوالٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔ ”اگر آپ کے پاس

اس قسم کے آٹھ دس اور میرے ہوں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ لکھنؤ کے امیر ترین آدمی ہیں۔“

معظم علی نے کہا۔ ”اس پٹیلی میں تیس ہیرے اور ہیں لیکن مجھے ان کی کوئی پہچان نہیں۔ میں نے ایک ہیرا جو اس سے ذرا چھوٹا تھا، لکھنؤ میں بارہ سو آخری کے عوض بیچا تھا اور اس ہیرے کو فروخت کرنے کے لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتا ہوں۔“
 لکھنؤ میں آپ کو کسی نے ٹھگ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس ہیرے کے عوض بھی آپ کو پانچ گنا زیادہ دلا سکوں گا۔“

معظم علی نے اس کے ہاتھ میں پٹیلی دیتے ہوئے کہا۔ ”انہیں بھی دیکھ لیجیے یہ فخر الدین نے پٹیلی اپنی پٹیلی پر لٹنے کے بعد کہا۔ یہ ہیرے بہت قیمتی ہیں لیکن آپ نے اسے کہاں سے؟“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”یہ آبا جان کو سراج الدولہ کا آخری انعام تھا۔“
 فخر الدین نے کہا۔ ”اب مجھے مہمان خانے پر پیرا لگانا پڑے گا۔ آپ نے کسی اور کو تو نہیں بتایا؟“
 ”نہیں۔“

”آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔“

کہتے تھے کہ گھوڑوں کی تجارت کے لیے ہمیں لکھنؤ میں مستقل طور پر ایک نہایت کشادہ مکان کی ضرورت ہے۔

شیر علی نے دلاور خاں سے چند سوالات پوچھے اور ناشتے کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔ دن کے تیسرے پہر شیر علی، دلاور خاں کے ساتھ شہر کے مغربی دروازے پر کھڑے معظم علی کا انتظار کر رہا تھا۔ عصر کی نماز کے تھوڑی دیر بعد سڑک پر ایک قافلے کی جھلک دکھائی دی اور دلاور خاں نے کہا: "جناب! وہ آگئے!"

تھوڑی دیر بعد قافلہ کچھ فاصلے پر سڑک سے اتر کر ایک کھیت میں رُک گیا اور شیر علی اور دلاور خاں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے۔

معظم علی، شیر علی کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور اکبر خان نے اس کی تقلید کی۔ شیر علی نے آگے بڑھ کر گر محوشتی سے ان کے ساتھ باری باری مصافحہ کیا اور کہا:

"آپ کو یہاں رکنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمام انتظامات کر لیے ہیں۔ شہر کی دوسری طرف مصافحات کی ایک بستی میں مجھے ایک بہت کھلی حویلی مل گئی ہے۔ حویلی کا مالک

نہایت شریف آدمی ہے اور اس نے مجھے یہ کہا ہے کہ آپ پندرہ بیس دن کے لیے اپنے گھوڑے اور نوکر یہاں رکھ سکتے ہیں اور اس کے لیے میں کوئی کرایہ وصول نہیں کروں گا۔

اس کے بعد اگر مجھے مناسب قیمت مل گئی تو میں حویلی آپ کے ساتھ فروخت کر دوں گا جو حویلی کے اندر ایک چھوٹا سا دروازہ مکان بھی ہے جو بالکل نیا ہے۔ ایک طرف چند پرانی کوٹھڑیاں

ہیں جو نوکرؤں کے کام آسکتی ہیں۔ گھوڑے ابھی ہمیں کھلے صحن میں باندھنے پڑیں گے اگر حویلی کے مالک کے ساتھ ہمارا سودا ہو گیا تو گھوڑوں کے اصطبل تعمیر کرنے کے لیے اس

میں کافی جگہ ہے۔

معظم علی نے سوال کیا: "آپ نے اس سے قیمت کے متعلق پوچھا ہے؟"

"جی ہاں میں نے پوچھا تھا لیکن وہ براہ راست آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

بارہواں باب

ایک صبح صابر شیر علی کے لیے ناشتا تیار کر رہا تھا کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد کسی نے آواز دی: "صابر، صابر دروازہ کھولو!"

صابر نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو اس کے سامنے دلاور خاں گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ صابر نے بدحواس ہو کر سوال کیا: "معظم علی خاں کہاں ہیں؟"

"وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔ دلاور خاں سے صحن میں پاؤں رکھتے ہوئے چلے آیا۔ صابر! کون ہے؟ مکان کے ایک کمرے سے شیر علی کی آواز سنی دینی۔

جی دلاور خاں آگیا ہے۔"

شیر علی جلدی سے باہر نکل آیا۔ صابر دلاور خاں سے کئی سوالات پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ پر گھوڑے کی باگ دے کر جلدی سے آگے بڑھا اور شیر علی سے مخاطب ہو کر بولا: "جناب خاں صاحب ارہے ہیں۔ مجھے انھوں نے یہ اطلاع دینے کے لیے بھیجا

ہے کہ وہ شام تک پہنچ جائیں گے۔ وہ اپنے ساتھ اتنی گھوڑے لارہت ہیں۔ اس لیے آپ شہر سے باہر فوراً کوئی ایسا مکان کرائے پر حاصل کریں جہاں گھوڑوں کے علاوہ پندرہ بیس

آدمیوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہو سکے۔ خاں صاحب نے کہا ہے کہ اگر شہر کے باہر کوئی ایسی کشادہ حویلی مل جائے جس کے اندر ایک رہائشی مکان بھی ہو تو زیادہ اچھا ہوگا۔ اگر کرائے

کی بجائے قیمت پر کوئی موزوں جگہ ملے تو قدر میں وہ آتے ہی قیمت ادا کریں گے۔ وہ یہ

وہ عروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے شہر کی دوسری طرف ایک بستی میں داخل ہوئے۔
حویلی کا مالک دروازے پر کھڑا تھا۔ شیر علی نے معظم علی کے ساتھ اس کا تعارف کرایا تو
معظم علی نے کہا: "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اگر آپ اس قدر نیا صنی سے کام نہ لیتے
تو ہمیں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔"

حویلی کے مالک نے کہا: "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ جگہ کسی کام آ رہی ہے،
یہ حویلی ایک سرائے تھی۔ پہلے یہاں کافی رونق رہا کرتی تھی لیکن اب شہر میں چند نئی سرائیاں
بن گئی ہیں اور مسافر یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے۔ پچھلے سال جب میں نے اسے خریدا تھا تو
یہ نہایت شکستہ حالت میں تھی۔ میں اسے مرمت کروا چکا ہوں۔ اس کے اندر کام کا صرف
ایک مکان تھا اور اس پر میں نے بالا خانہ تعمیر کرایا ہے۔ تین چار مہینے میں نے سرائے کا
کاروبار چلانے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی نامدہ نہیں ہوا۔ کبھی باہر سے کوئی بڑا قافلہ آتا تھا
تو لوگ مجبوری کی حالت میں ایک آدھ دن کے لیے یہاں اتر پڑتے تھے لیکن اس کے بعد
وہ شہر میں چلے جاتے تھے۔ اس لیے میں نے سرائے کا کاروبار بند کر دیا۔ آپ کے کاروبار
کے لیے یہ جگہ بہت موزوں ہوگی اور اگر آپ خریدنا چاہیں تو میں کوئی نفع لیے بغیر فروخت
کرنے کے لیے تیار ہوں۔ فوراً فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ اسے اندر باہر سے
اچھی طرح دیکھ لیں!"

"چلیے ابھی دیکھ لیتے ہیں" معظم علی سرائے کے مالک کے ساتھ اندر داخل ہوا اور صحن
میں کھڑا ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد بولا: "یہ جگہ ہمارے کام آسکتی ہے۔
آپ قیمت بتائیں!"

"نہیں آپ اچھی طرح دیکھ لیں۔ آئیے میں آپ کو وہ مکان دکھاتا ہوں۔"
مالک مکان کے احرا پر معظم علی اس کے ساتھ چل پڑا۔ بجلی منزل کے پانچ کمرے
دکھانے کے بعد وہ اسے بالا خانے پر لے گیا۔ وہاں تین کشتہ کردوں کے سامنے ایک بڑا

تھا اور برآمدے کے سامنے کھلی چھت ایک چھوٹے سے صحن کا کام دیتی تھی۔
معظم علی نے بالا خانے سے حویلی کا جائزہ لینے کے بعد مالک مکان سے کہا: "آپ
سودے کی بات کریں!"

مالک مکان نے کہا: "لیکن جناب اس طرف دیوار کے ساتھ چند کوٹھڑیاں ہیں نیچے اتر
کر آپ وہ بھی دیکھ لیں۔"

"میں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس حویلی کا بہت سا حد
دوبارہ تعمیر کرنا پڑے گا۔ آپ بلا جھجک قیمت بتائیں!"

مالک مکان نے جواب دیا: "جناب میں آپ کو کاغذات دکھا سکتا ہوں۔ میں
نے سات ہزار میں یہ حویلی خریدی تھی اور قریباً اڑھائی ہزار روپیہ اس پر ادھر خرچ کر چکا
ہوں۔ حویلی کا سودا چند آدمیوں کے سامنے ہوا تھا۔ صبح تک میں انھیں بھی آپ کے سامنے
پیش کر دوں گا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو دس ہزار روپیہ دینے کے لیے تیار ہوں
پانچ سو آپ کا نفع ہو گا۔"

"میں اس پانچ سو کو نفع کی بجائے ایک امیر آدمی کا انعام سمجھوں گا۔ مجھے دس ہزار
منظور ہے لیکن میں آپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں
نے یہ حویلی خریدی تھی تو یہاں دو غریب عورتیں رہتی تھیں۔ سرائے کے پہلے مالک نے مجھ
سے درخواست کی تھی کہ میں انھیں یہیں رہنے دوں، وہ بے سہارا ہیں اور گادوں کے لوگوں
کے کپڑے سے کراپنا پیٹ پالتی ہیں۔ کبھی کبھی میری بیوی کچھ مدد کر دیا کرتی ہے، جب کبھی یہاں
مسافر آتا کرتے تھے تو انھیں بہت تکلیف ہوتی تھی اور وہ سارا دن اپنی کوٹھڑی کا دروازہ
بند کر کے پڑی رہتی تھیں۔ میں نے کونے کی ایک کوٹھڑی کے سامنے ان کے پردے کے
لیے ایک چھوٹی سی دیوار بنوا دی ہے۔ وہ نہایت نیک ہیں اور آپ جیسے خدائیں لوگوں

تھارے سارے گاؤں سے زیادہ ہے۔

تین دن کے اندر معظم علی بیس گھوڑے فروخت کر چکا تھا۔ چوتھے روز ایک خوش پوش اصہبی اس کے پاس آیا اور اس نے تیس گھوڑے منتخب کر کے ان کی قیمت طے کرنے کے بعد کہا۔ "میں یہ گھوڑے بنارس کے راجہ کے لیے خریدنا چاہتا ہوں لیکن گھوڑوں کو بنارس پہنچانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ ان کی قیمت بھی آپ کو وہیں ادا کی جائے گی۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "مجھے بنارس پہنچانے میں کوئی عذر نہیں لیکن اگر راجہ نے نے یہ گھوڑے پسند نہ کیے تو۔۔۔۔۔"

"میں راجہ کا چچا زاد بھائی ہوں۔ اس نے جواب میں کہا۔

"آپ کب جانا چاہتے ہیں؟"

"کل۔"

معظم علی شیر علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "چچا! آپ بنارس جانا پسند کریں گے؟"

"کیوں نہیں۔ میں ابھی جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"بہت اچھا آپ کل ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔"



دو دن بعد مکھنویں یہ افواہ گرم تھی کہ دتاجی سندھیا کی افواج نجیب الدولہ کو مغلوب کرنے کے لیے سہارنپور کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔ روسیکھنڈ کے مسلمانوں کے نزدیک نجیب الدولہ ایک بہت بڑے قومی ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اکبر خاں یہ خبر سنتے ہی اپنے ساتھیوں کو گھوڑوں پر زینیں ڈالنے کا حکم دے کر بلا خانے پر معظم علی کے کمرے میں داخل ہوا۔ معظم علی دریچے کے سامنے کرسی پر بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "اکبر

کی اعانت کی مستحق ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ انہیں وہاں رہنے دیں۔"

معظم علی نے اپنی جیب سے چاندی اور سونے کے چند کے نکال کر حویلی کے مالک کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "انہیں ہماری طرف سے پیش کر دیں اور صبح یہاں تشریف لاکر اپنی رقم وصول کر لیں۔"

اس کے بعد معظم علی، شیر علی خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب گھوڑوں کی دیکھ بھال اور نوکروں کے قیام و طعام کا انتظام آپ کے ذمہ ہے۔ میں اکبر خاں کے ساتھ شہر کے مکان میں جاتا ہوں۔ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کل ہم یہاں آجائیں گے۔"



اگلے دن معظم علی شہر کے مکان سے اپنا مختصر سا سامان اس حویلی میں منتقل کر چکا تھا۔

بالائی منزل کے کمرے وہ اپنی رہائش کے لیے منتخب کر چکا تھا۔ شیر علی نجی منزل کے ایک کمرے میں اپنا دفتر سمجھا رہا تھا۔ شہر سے گھوڑوں کے خریدار جو درجہ دار ہوں جمع ہو رہے تھے اور حویلی ایک اچھی خاصی منڈی معلوم ہوتی تھی۔ اس پاس کے بہت سے لوگ صرف گھوڑے دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ صابر سارا دن کھانا پکانے اور برتن صاف کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ جب کبھی فرصت ملتی حویلی کا ایک چکر لگاتا۔ اسے وہ سفید گھوڑے جو اکبر خاں کو فخر الدین نے دیئے تھے، سید پسند تھے اور اس کی پسند کی وجہ یہ تھی کہ اس نے معظم علی اور اکبر خاں کو ان کی تعریف کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ کسی دیہاتی کو بازو سے پکڑ کر ان گھوڑوں کے پاس لے جاتا اور پوچھتا۔ "تھارے خیال میں ان گھوڑوں کی کیا قیمت ہوگی؟" وہ سادگی سے کوئی رقم بتاتا تو صابر جھنجھلا اٹھتا۔ "واہ کیا کہنے تمہاری پچان کے۔ ابلے آؤ ان کی قیمت

اور اس کے ساتھی گھوڑے پر زمینیں ڈال چکے تھے۔ معظم علی کے ایک ہاتھ میں روپوں کی تھیلی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر اکبر خاں کے کندھے پر دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اکبر یہ لو!"

"اس میں کیا ہے؟" اکبر خاں نے سوال کیا۔

اس میں تمہارے حصے کی کچھ رقم ہے جب دوبارہ ملاقات ہوگی تو ہم اطمینان سے بیٹھ کر حساب کریں گے۔ اس میں ساتھ اثرنیاں تمہارے آدمیوں کے لیے ہیں۔" اکبر خاں نے کہا۔ "بھائی جان آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ نوکروں کے متعلق میں آپ کو منع نہیں کرتا لیکن اپنے لیے میں ایک کوڑی قبول نہیں کر دوں گا۔" معظم علی نے کہا۔ "جو لوگ اپنا حق وصول نہیں کرتے وہ غاصبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔"

"لیکن اس تجارت میں میرا کوئی حصہ نہیں۔"

"یہ سوچنا میرا کام ہے۔" معظم علی نے یہ کہتے ہوئے سکوں کی تھیلی اکبر خاں کے گھوڑے کی خرمن میں ڈال دی۔

اکبر خاں نے احتجاجاً کہا۔ "بھائی جان مجھے روپے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں مجھ سے زیادہ ضرورت ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ تجارت میں جو نفع کماد اس کی ایک ایک کوڑی اپنے علاقے کے آدمیوں کو مبلغ کرنے پر صرف کرنا اس ملک میں صرف روز بیکھنڈ ایک ایسا خطہ ہے جہاں کے لوگ بطینیت، خود غرض، اور غلوچ حکمرانوں کی ہوس اقتدار سے آزاد ہیں۔"

اکبر خاں نے لاجواب ہو کر کہا۔ "میں آپ کی حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس روپے پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔"

معظم علی مسکایا: تمہیں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ میں تمہیں کوئی غلط حکم نہیں دوں گا۔

بیٹھ جاؤ!"

اکبر اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور معظم علی نے کہا۔ "ہماری ابتدا بہت اچھی ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ یہ گھوڑے اتنی جلدی بک جائیں گے۔ میں شیخ فخر الدین کو پیغام بھیج رہا ہوں کہ ہمارے لیے دوسو گھوڑے اور خریدیں۔ ان کا جواب آنے پر مجھے وہاں جانا پڑے گا۔ اب مجھے زندہ رہنے کے لیے کسی دلچسپی کی ضرورت ہے۔" اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بھائی جان! مرہٹوں کی فوج بھیلہ کے تعاقب میں سہارنپور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نے ابھی یہ خبر سنی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں فوراً گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"ان حالات میں تمہیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟" اکبر خاں نے جواب دیا۔ "میرے ساتھی گھوڑوں پر زمینیں ڈال رہے ہیں۔" معظم علی نے کہا۔ "بہت اچھا تم نیچے جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔" اکبر خاں نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔ "بھائی جان آپ خفا تو نہیں ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔"

معظم علی نے جواب دیا۔ "مرہٹوں کی پیشقدمی کی خبر سننے کے بعد اگر تم فوراً گھر جانے کے لیے تیار نہ ہوتے تو مجھے یقیناً افسوس ہوتا۔ مجھ سے زیادہ اس بات کا احساس اور کسے ہو سکتا ہے کہ روسیکھنڈ کے ایک معزز قبیلے کے سردار کی حیثیت میں تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں اور میں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس دن مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ تمہیں میری ضرورت ہے یا میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں تو میں بن بلائے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

اکبر خاں کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد معظم علی بالا خانے سے اتر کر حویلی کے صحن میں داخل ہوا تو اکبر خاں

تر تھا اور اس کی تمام شوخی ختم ہو چکی تھی لیکن جب معظم علی حویلی کی ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تو گھوڑے نے پھر کو دنا شروع کر دیا۔ اچانک چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت ڈیوڑھی سے باہر نکلی اور بے خیالی میں گھوڑے کے سامنے آگئی۔ معظم علی نے جلدی سے گھوڑے کی باگ موڑی لیکن بدحواس عورت نے کئے یا چھپے ہٹنے کی بجائے گلی کی دوسری طرف جانے کی کوشش میں گھوڑے سے ٹکرانی اور منہ بے ل گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے مٹی کا پیالہ گر کر چٹا چور ہو گیا۔ معظم علی نے پوری قوت کے ساتھ باگ کھینچ کر گھوڑے کو روکا اور بچنے کو دکر بھاگتا ہوا عورت کے قریب پہنچا وہ بیہوش تھی۔ چادر اس کے سر سے کھسک چکی تھی اور اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اچانک زندگی کی تمام حیات سمٹ کر معظم علی کی آنکھوں میں آگئیں۔ وہ چلانا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق میں آواز نہ آتی۔ ساڑھے تین گھنٹے کے ٹوٹے ہوئے تار دوبارہ جڑ چکے تھے اور زندگی کی اداس اور معنوم فضا میں محبت کے نقوش سے بھرپور رہی تھیں۔ اندھیری رات کے سفر کے راستے کا ہر پتھر ایک چراغ بن چکا تھا۔ فرحت! فرحت! اس نے کہا اور پھر کسی توقف کے بغیر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر حویلی میں داخل ہوا۔ اس کے پاؤں زمین پر تھے لیکن اس کی روح مسرت کے ساتھ آسمان پر تھی۔ نچلی منزل کے ایک کمرے میں پہنچ کر اس نے فرحت کو چار پائی پر لٹا دیا۔ نوکر جو دہاں جمع ہو چکے تھے، اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر ادھر ادھر بٹ گئے۔ معظم علی کی خوشی اب پریشانی اور گھبراہٹ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے صابر کو آواز دے کر پانی مانگا۔ صابر پانی کا کٹورا لے آیا اور معظم علی فرحت کے منہ پر پھینٹے مارنے لگا۔ فرحت نے آنکھیں کھولیں اور معظم علی کی کائنات مسکراہٹوں سے بھرپور ہو گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا: فرحت! فرحت! میں معظم علی ہوں!

فرحت مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔ بالآخر غریب آنسو

○ اسی دن گیارہ بجے کے قریب ہوتا ہوا بلانی منزل کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اسے ایک عورت جو اپنا جسم ایک میلی کچیلی چادر میں ڈھانچے ہوئے تھی، حویلی کے صحن میں داخل ہوئی۔ نوکر صحن میں بندھے ہوئے گھوڑوں کو پانی پلا رہے تھے۔ عورت ایک گھوڑے کے قریب سے گزر رہی تھی کہ گھوڑے نے اچانک بدک کر اپنے گلے پاؤں اٹھا لیے۔ عورت گھبرا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ ایک نوکر نے اس کی بدحواسی پر تہقہ لگایا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کے کونے کی طرف چلی گئی۔

معظم علی بھاگتا ہوا نیچے اترا اور اس نے نوکر کے منہ پر ایک پتھر رسید کرتے ہوئے کہا: "تمہیں ایک غریب اور بے بس عورت پر ہنسنے ہوئے شرم نہیں آئی اور یہ گھوڑا یہاں کس نے باندھا ہے؟ اسے یہاں سے جتاؤ اور راستے سے دوسرے گھوڑے بھی کھول کر ایک طرف باندھ دو۔ یہ کھونٹے بھی یہاں سے اکھاڑ دو!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی بالا خانے پر اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ دلا درخاں ایک طشت میں کھانے لے کر آگیا۔ معظم علی نے کہا: "مجھے بھوک نہیں۔ تم یہ کھانا ان غریب عورتوں کو دے دو جو ہماری حویلی میں رہتی ہیں اور میری طرف سے انھیں یہ کہو کہ آئندہ انھیں دونوں وقت کا کھانا ہمارے نگر خانے سے ملا کر دے گا۔"

شام کے وقت معظم علی بستی کی چھوٹی سی مسجد میں نماز پڑھ کر واپس آ رہا تھا کہ حویلی میں نوکروں کا شور سنا دیا۔ معظم علی نے جلدی سے اگر درجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اس کے ایک سرکش گھوڑے نے کوہدہ کو ایک نوکر کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ معظم علی نے نوکر کی ٹانگ پر اپنے ہاتھ سے پٹی باندھی اور کہا: "یہ گھوڑا بہت خطرناک ہوتا ہے بار بارچہ میں کل صبح اس پر سواری کروں گا۔"

اگلی صبح معظم علی گھوڑے سے پر سوار ہو کر باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو گھوڑا پسینے سے

مجھے اب بھی یقین نہیں اما کہ میں ہوں اور آپ مجھ سے اس قدر قریب ہیں۔
فرحت بری طرح سسکیاں لے رہی تھی۔

معظم علی نے کہا: "فرحت چلو تمہاری امی جان کے پاس چلتے ہیں۔"
فرحت اپنے جسم پر چادر پٹینے کے بعد معظم علی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔ نوکر صحن
میں ایک جگہ جمع ہو کر پریشانی کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فرحت
کو معظم علی کی موجودگی کے سوا اب کسی بات کا احساس نہ تھا۔ وہ خوشی کے سمندر میں غوطے
کھا رہی تھی اور اس کے پاؤں ڈنگا رہے تھے۔ چوبی کے کونے میں قد آدم ادبچی دیوار کے
ایک چھوٹے سے دروازے سے گزرنے کے بعد وہ تنگ صحن کے اندر داخل ہوئے۔ سامنے
کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ فرحت نے آہستہ سے کہا: "آپ یہیں ٹھہریں؟"
کوٹھڑی سے ایک خیف آواز سنائی دی۔ "فرحت تم نے اتنی دیر کہاں کر دی؟"
فرحت کو ٹھڑی میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں ایک سیلے کیلے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔
فرحت نے آگے بڑھ کر بے اختیار سسکیاں لیتے ہوئے اپنا سرماں کے سینے پر
لکھ دیا۔

"فرحت! فرحت! کیا ہوا بیٹی؟ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
کرب انگیز لہجے میں کہا: "خدا کے لیے بتاؤ تمہیں کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟"
فرحت نے کہا: "امی جان وہ مل گئے ہیں۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ انھوں نے
مجھے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ میں بگلی ہوں؟"

"کوئل مل گئے ہیں؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟"
"امی جان یوسف علی کے بھائی آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔" فرحت نے گردن اٹھا
کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ماں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور کہا: "بیٹی تمہیں کیا ہو گیا ہے کہاں

اس کی آنکھوں سے اٹھڑے اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "میں پہلے بھی ایسے
خواب دیکھ چکی ہوں۔"

"ہم دونوں ایسے خواب دیکھ چکے ہیں۔ فرحت! تم کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"
"نہیں۔ مجھے معلوم نہیں گرنے کے بعد مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کب سے یہاں ہوں؟"
مجھے امی جان کے پاس جانا چاہیے۔ وہ بیمار ہیں۔ میں ان کے لیے دودھ لینے جا رہی تھی۔
فرحت یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

معظم علی نے کہا: "نہیں میں رہو۔ میں تمہاری امی جان کو لے آتا ہوں۔"
"نہیں نہیں آپ دہاں رہ جائیں۔ وہ کوٹھڑی اس قابل نہیں کہ آپ اس میں
پاؤں رکھیں۔"

معظم علی نے کہا: "فرحت کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں ہو! میں تم کو دلی سے لے
کر حیدرآباد تک تلاش کر چکا ہوں۔"

فرحت نے کہا: "میرا خیال تھا کہ اب دنیا میں سبھی کسی کو تلاش نہیں ہوگی کبھی
میں یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ اس حالت میں شاید آپ میں پہچان بھی نہ سکیں۔ میں
بہشت یہ سوچا کرتی تھی کہ آپ کسی دن ضرور آئیں گے جب مامک مکان آپ کی طرف سے روپے
لے کر آیا تھا تو میں نے اس سے آپ کا نام پوچھا تھا۔ اگلے دن میں دروازے کی آڑ میں کھڑی
باہر جھانک رہی تھی کہ مجھے آپ کی جھلک دکھائی دی۔"

"اور اس کے باوجود تم نے مجھے اپنا پتہ دینا گوارا نہ کیا؟"
"مجھے یہ پتہ تھا کہ آپ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر مزہ نہیں لیں گے۔ میں سوچتی تھی کہ
جب میں یہ کہوں گی کہ میں فرحت ہوں تو میری صورت دیکھ کر آپ تمہارے لگائیں گے اور
اپنے نوکرؤں سے کہیں گے کہ اس بگلی کو چوبی سے باہر نکال دو۔ میں نے امی جان سے
آپ کا ذکر کیا تھا اور وہ یہ کہتی تھیں کہ تم بالکل ہو گئی ہو۔ تمہیں یہ اتنی معلوم علی نظر آتا ہے

یہ بہترین مکان کا بندوبست کر دوں گا۔ میں نے شہر کے بہترین طبیب کے پاس آدھی بیچ دیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک پہنچ جائے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ طبیب کی آمد سے پہلے پہلے آپ کو دوسرے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ میں آدمیوں کو بلاتا ہوں۔ معظ علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن عابدہ نے کہا: بیٹا آدمیوں کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں چل سکتی ہوں لیکن تم تکلیف کیوں اٹھاتے ہو؟

معظ علی نے کہا: میرے لیے اس سے بڑی تکلیف اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑی ہوئی ہیں۔ فرحت اٹھو اور اپنی امی جان کو سہارا لے کر بالا خانے پر لے چلو!

عابدہ نے کہا: بہت اچھا بیٹا! لیکن ہم شہر نہیں جائیں گے۔

فرحت نے کہا: اگر آپ ہمیں اس لیے شہر بھیجا چاہتے ہیں کہ ہمیں بالا خانے پر رہنے سے آپ کے دوستوں اور مہمانوں کو تکلیف ہوگی تو ہمیں یہیں پڑا رہنے دیں۔ معظ علی نے جواب دیا: مجھے صرف آپ کی تکلیف کا خیال تھا لیکن اگر آپ بالا خانے میں رہنا پسند کریں تو میرا کوئی دوست یا مہمان آپ کی اجازت کے بغیر اس حویلی میں داخل نہیں ہو گا؟



تھوڑی دیر بعد عابدہ بالا خانے کے ایک کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ فرحت اس کی چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی اور معظ علی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ عابدہ کے سوالات کے جواب میں معظ علی نے مختصراً اپنی قید، رہائی اور سفر کے واقعات بیان کیے اور اس کے بعد عابدہ سے اپنی سرگزشت سنانے کو کہا۔

عابدہ نے جواب میں اپنے مصائب کی داستان شروع کرتے ہوئے کہا: بیٹا تمہاری گرفتاری کے بعد ہمارے دل میں یہ غم پیدا ہو گیا تھا کہ میرا کسی نہ کسی ہمارے

ہیں وہ؟

معظ علی کو ٹھڑی میں داخل ہوا۔ مرزا حسین بیگ کی بیوی کی بے سروسامانی کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو اڑ گئے اور اس نے کہا: چچی جان میں معظ علی ہیں۔ عابدہ چٹی پٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فرحت نے جلدی سے دوسری چارپائی کا میلا کچلا بستر لپیٹ کر ایک طرف پھینک دیا اور کہا: بیٹھ جلیے۔ معظ علی نے آگے بڑھ کر عابدہ کی بخش پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: چچی جان آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ میں ابھی طبیب کو بلاتا ہوں۔ پھر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور عابدہ کے قریب دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ معظ علی نے فرحت سے سوال کیا: چچی جان کب سے بیمار ہیں؟

فرحت نے جواب دیا: ابا جان کی وفات کے بعد سے ان کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ پچھلے مہینے ان کی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی لیکن اب کوئی دو ہفتے سے پھر بخار رہتا ہے۔

معظ علی نے کہا: چچی جان یہ کوٹھڑی آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔ آپ چل سکیں گی یا میرے نوکر آپ کی چارپائی اٹھا کر لے جائیں؟

عابدہ نے کہا: بیٹا مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ میں آپ کو دوسرے کمرے میں لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ کو تازہ ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے۔

عابدہ نے جواب دیا: بیٹا تم کیوں تکلیف اٹھاتے ہو، مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ معظ علی نے کہا: چچی جان میں آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ آپ کچھ دیر بالا خانے میں قیام کریں، اس کے بعد میں شام سے پہلے شہر میں آپ کے

تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ہمارا دوسرا نوکر کہیں بھاگ گیا۔ ایک دن سرائے کے مالک نے ہمیں اطلاع دی کہ چند آدمی حیدر آباد جا رہے ہیں اگر آپ اپنے رشتہ داروں کو کوئی خط بھیجنا چاہیں تو وہ پہنچا دیں گے۔ میں نے خط لکھ کر ان کے حوالے کیا لیکن دو ماہ گزر گئے اور اس کا کوئی جواب نہ آیا اور میں یہ سمجھنے لگی کہ اب زمانے کی نگاہیں بدل گئی ہیں اور ہمارے رشتہ داروں نے جان بوجھ کر ہماری طرف توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں اس حالت میں ان کے پاس جاؤں۔

پھر ایک دن مجھے یہ خیال آیا کہ شاید انھیں میرا کوئی پیغام نہ ملا ہو اور میں حیدر آباد جانے کے لیے تیار ہو گئی لیکن کھنڈ سے قافلے کی روانگی سے دو دن قبل مجھے بخار ہو گیا اور مجھے سفر کا ارادہ ملوٹی کرنا پڑا۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ اگر میرے رشتہ داروں کو میری طرف سے کوئی پیغام نہ ملا ہو تو بھی ان کا فرض تھا کہ وہ مرشد آباد جا کر ہمارا پیہ کرتے۔ اس کے بعد انھیں یقیناً یہ معلوم ہوا کہ ہم کھنڈ چلے گئے ہیں۔ میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب میں خدا کے سوا کسی کی مدد نہیں تلاش کروں گی۔ سرائے کا مالک ہمارے حال پر بہت مہربان تھا۔ اس کی بیوی بھی بہت رحم دل تھی۔ وہ ہمارے لیے اس بستی اور کبھی شہر کی عورتوں سے بھی سلائی کا کام لے آتی تھی۔ جب وہ سرائے پہنچ کر چلا گیا تو ہمیں بہت صدمہ ہوا لیکن سرائے کا نیا مالک بھی ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ کئی مہینوں سے یہ سرائے بالکل ویران تھی اور ہمیں یہاں دھشت ہوتی تھی لیکن اس بستی کے لوگ بہت شریفیت ہیں اور ان کا سلوک دیکھ کر میں نے شہر میں اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

منظر علی نے کہا: ”جی جان مجھے صرف یہ شکایت ہے کہ فرحت نے جان بوجھ کر مجھے اپنا پتہ نہیں دیا اسے معلوم تھا کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔“
عابدہ نے جواب دیا: ”بیٹا مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ تم یہاں ہو اور

عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ محلے کے لوگوں کی بھی یہی رائے تھی کہ ہم فرزند مرشد آباد سے نکل جائیں۔ اگلے دن ہم نے قافلے کے ساتھ مرشد آباد سے ہجرت کی۔ شہر کے دروازے پر میر جعفر کے سپاہیوں نے ہماری تلاشی لی اور ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ ہم سے چھین لیا۔ راستے میں فرحت کے ابا جان بیمار ہو گئے۔ چند دن وہ بیماری کی حالت میں قافلے کا ساتھ دیتے رہے لیکن اس کے بعد ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ہمارے ساتھ آکرے کا ایک نیک دل حاضر تھا۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ جب ہمیں مجبوری کی حالت میں ایک بستی میں رکتا ہوا اس تاجر نے چند روپے فرحت کے ابا جان کو پیش کرتے ہوئے کہا: ”آپ کو کھنڈ پہنچنے کے لیے ان کی ضرورت پڑے گی اس لیے اسے قبول فرمائیں۔“ فرحت کے ابا جان نے اس کے اصرار پر یہ روپے لے لیے۔ رخصت ہوتے وقت اس نے بستی کے زمیندار کو ہمارے متعلق بہت تاکید کی۔ زمیندار بھی کوئی نیک آدمی تھا اور اس نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ فرحت کے ابا جان کی وفات کے بعد جب ایک اور قافلہ اس بستی سے گزرا تو ہم اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ دو نوکر ابھی تک ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارا قافلہ رات کے وقت کھنڈ کے قریب پہنچا اور بہت سے آدمیوں نے شہر میں جانے کی بجائے اس سرائے میں قیام کیا۔ ہم بھی یہیں ٹھہر گئے۔ یہاں رات گزارنے کے بعد صبح ہم نے شہر جا کر اپنے رشتہ داروں کا پتہ کیا لیکن ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد جا چکے ہیں۔ ہم سارا دن شہر میں گھومتے رہے لیکن کسی نے ہمارے حال پر توجہ نہ دی۔ شام کے وقت ہم پھر اسی سرائے میں واپس آ گئے۔

اگلے روز میں نے ایک نوکر کو اپنے رشتہ داروں کے نام خط دے کر حیدر آباد روانہ کیا لیکن اس کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

ہمیں یقین تھا کہ حیدر آباد اطلاع پہنچے ہی ہمارا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ہماری مدد کے لیے پہنچ جائے گا لیکن آج تک ہم ان کی راہ دیکھتے رہے ایک ماہ بعد جب ہماری پونجی

فرحت کو اس بات کا ڈر تھا کہ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر تعین تکلیف ہوگی اور شاید تم ہمیں پہچان بھی نہ سکو۔

اسے میں صابر نے دروازے کے پاس اگر آفا دی۔ جناب! حکیم صاحب تشریف لے آئے۔

”انہیں اوپر لے آؤ!“ معظ علی نے کہا۔

فرحت جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ایک عمر سیدہ طبیب کمرے میں داخل ہوا۔ معظ علی نے اس کے لیے اپنی کرسی خالی کر دی۔ طبیب نے عابدہ کی نبض دیکھی اور اس سے چند سوال پوچھنے کے بعد معظ علی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میں جا کر ابھی دوا بھیجتا ہوں۔ امید ہے کہ کل تک بخار ٹوٹ جائے گا اور اگر کچھ آفاقہ نہ ہوا تو میں انہیں کل شام دوبارہ آکر دیکھوں گا۔“

معظ علی نے کہا: ”میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک یہ تندرست نہیں ہوتی، آپ ہر روز کم از کم دوبارہ انہیں دیکھنے کے لیے ضرور تشریف لایا کریں۔ میں دونوں وقت آپ کے لیے گھوٹا بیج دیا کروں گا۔“

طبیب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا: ”بہت اچھا میں شام کو پھر آؤں گا۔“

معظ علی اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا اور صابر سے جو دروازے کے باہر کھڑا تھا، مخاطب ہو کر بولا: ”صابر دلا درخاں سے کہو کہ حکیم صاحب کے ساتھ جا کر دالے آئے۔“ پھر اس نے اپنی جیب سے چند سکہ نکال کر طبیب کو پیش کرتے ہوئے کہا: ”یہ قبول فرمائیے۔“

طبیب نے جواب دیا: ”نہیں! میں مرلیفہ کے تندرست ہونے سے پہلے کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔“

معظ علی نے کہا: ”حکیم صاحب یہ علاج کا معاوضہ نہیں۔ یہ شہر سے یہاں تک

آنے کی تکلیف کا صلہ ہے، لیجیے جب مرلیفہ تندرست ہو جائے گی تو میں جی کھول کر آپ کی خدمت کروں گا۔“

معظ علی کے اصرار پر طبیب نے چند سکہ اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھے بغیر اپنی جیب میں ڈال لیے لیکن جو علی سے باہر نکل کر اس نے جیب سے چاندی اور سونے کے سکہ نکال کر دیکھتے ہوئے دلا درخاں سے کہا: ”تمہارا مالک بہت امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔“

دلا درخاں نے فرسے جواب دیا: ”جناب میرا مالک بادشاہ ہے۔“

”لیکن وہ عورت تو بہت عزیز معلوم ہوتی تھی؟“

دلا درخاں نے جواب دیا: ”جناب جب آپ دوسری دفعہ تشریف لائیں گے تو وہ آپ کو عزیز نہیں معلوم ہوگی۔ خاں صاحب نے بالا خانے کے کمرے انہیں دے دیئے ہیں اور خود نیچے آگئے ہیں۔“

دلا درخاں کا قیاس صبح تھا۔ جب شام کے وقت طبیب دوبارہ عابدہ کو دیکھنے آیا تو اس کا کہہ تمہی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ مرلیفہ بوسیدہ لباس کی بجائے نیا لباس پہنے ایک خوبصورت پنگ پریٹی ہوئی تھی۔ طبیب نے نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ”بخار بہت کم ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میری توقع سے پہلے تندرست ہو جائیگی۔“

اگلے دن عابدہ کا بخار اتر چکا تھا اور وہ قدرے بشاش معلوم ہوتی تھی۔ تیسرے دن اسے پھر بخار آگیا لیکن شدت نسبتاً کم تھی۔ پانچویں روز طبیب نے اعلان کیا کہ اب انہیں انشاء اللہ بخار نہیں ہوگا۔



بالا خانے کے تمام کمرے فرحت اور اس کی ماں کے لیے وقف تھے اور معظ علی نجلی منزل کے ایک کمرے میں آگیا تھا۔ جب تک عابدہ بیمار تھی وہ ہر روز متعدد بار اس کے

کمرے میں حاضری دیا کرتا تھا لیکن عایدہ کے تندرست ہونے کے بعد اس کے طرز عمل میں تبدیلی آگئی تھی۔ کسی معقول وجہ کے بغیر بالا خانے پر جاتے ہوئے جھبک محسوس کرتا تھا۔ کبھی فرحت کی ماں بلاتی تو چلا جاتا اور اندر داخل ہونے سے پہلے دروازے پر دستک دیتا۔ فرحت جو پہلے اپنی ماں کی موجودگی میں بے تکلفی سے اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی اب اس کی آواز سنتے ہی دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ معظ علی کے نوکروں میں سے صابر کے سوا کسی کو اوپر آنے جانے کی اجازت تھی ایک شام صابر کھانا لایا تو معظ علی کو معمول سے زیادہ لذیذ معلوم ہوا۔ اس نے کہا: "صابر آج کیا ڈالا ہے تم نے سان میں؟"

صابر نے بدحواس ہو کر جواب دیا: "جی میں بے قصور ہوں۔ میں نے کچھ نہیں ڈالا۔ یہ سالن چھوٹی بی بی نے لکایا ہے اور میں نے تو چکھا بھی نہیں۔ صبح جب میں ادا پر کھانا لے کر گیا تو وہ بہت خفا ہوئیں اور کہنے لگیں: "آج شام ہڈیاں میں خود لپکاؤں گی۔ میں نے انھیں سمجھایا تھا کہ آپ میرے سوا کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں کرتے لیکن وہ کہتی تھیں:۔۔۔۔۔"

کیا کہتی تھیں وہ؟

کچھ نہیں، جی وہ کہتی تھیں کہ تم گوشت کو دال سے بدتر بنا دیتے ہو۔" معظ علی مسکرایا: "صابر وہ بالکل درست کہتی تھیں۔ میں آج کئی دنوں کے بعد پیٹ بھر کر کھا رہا ہوں لیکن انھیں تکلیف دینا تمہیک نہیں!" "جی میں نے کہا تھا کہ آپ بخانا ہوں گے لیکن انھوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اوپر بادچی نا نہیں ہے۔ وہ اصرار کرتی تھیں کہ آپ نیچے بادچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار بنو ادیں۔"

معظ علی نے کہا: "ان سے کہنا کہ میں بہت جلد دیوار بنوادوں گا اور انھیں نیچے آنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ہمارے لیے کھانا لپکائیں۔ وہ اگر حائل

تو بادچی خانے میں آکر تمھاری دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔"

میری دیکھ بھال؟ صابر نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

معظ علی نے جواب دیا: "میرا مطلب ہے کہ تم کھانا پکانے کے متعلق ان کی ہدایات لے سکو گے اور ہو سکتا ہے کہ تم بھی انھیں کچھ سکھا سکو۔"

صابر کو کھانا پکانے کے مسئلے میں کسی کی نکتہ چینی یا مداخلت پسند نہ تھی۔ اگر یہ مداخلت فرحت کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو وہ یقیناً شدید احتجاج کرتا۔ مگر اس نے کہا:

"جناب یہ کھانا واقعی لذیذ ہے یا آپ مجھے یہ قوت بنا رہے ہیں؟"

معظ علی نے ہنستے ہوئے کہا: "صابر تم بہت ہی سادہ دل ہو۔"

صابر نے کہا: "جناب وہ بھی یہی کہتی تھیں۔"

کون؟

چھوٹی بی بی جی۔ وہ تو یہ بھی کہتی تھیں کہ میرا دماغ بالکل خالی ہے۔"

چند دن بعد نجی منزل کے کمروں اور بادچی خانے کے سامنے پردے کے لیے دیوار تعمیر ہو چکی تھی اور مہمانوں کے لیے حویلی کے اندر صدر دروازے کے قریب تین نئے کمروں کی بنیادیں کھودی جا رہی تھیں۔



گھوڑوں کی تجارت شروع کرنے سے پہلے معظ علی یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے اپنے دل سے تنہائی اور بے کسی کا احساس دور کرنے کے لیے کسی مصروفیت کی ضرورت ہے لیکن فرحت کو تلاش کر لینے کے بعد وہ حوصلوں، دلوں، امیدوں اور آرزوؤں کی ایک نئی دنیا میں آچکا تھا وہ ایک کامیاب تاجر کی حیثیت میں اپنی ذات کو دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ منہید بنانا چاہتا تھا۔

ایک شام وہ گھوڑے پر سیر کرنے کے بعد واپس آیا تو حویلی میں چند گاڑیاں کھنپائیں

یہ کیا ہے؟ اس نے گھوڑے سے اتر کر ایک نوکر سے سوال کیا۔

نوکر نے جواب دیا۔ "جناب شیر علی خاں واپس آگئے ہیں۔"

میں پوچھتا ہوں یہ گاڑیاں کہاں سے آئی ہیں اور شیر علی کہاں ہیں؟

شیر علی ایک گاڑی کی آڑ سے نمودار ہوا اور اس نے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ گاڑیاں آپ کی ہیں۔ میں بنارس سے گھوڑوں کی قیمت وصول کر کے کپڑا خریدا ہوں۔ کھنڈ میں بنارس پرٹے کی بڑی مانگ ہے۔ انشاء اللہ ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔"

معظم علی نے کہا۔ "واہ جی، اب آپ گھوڑوں کے بعد مجھ سے کپڑوں کی تجارت بھی کروانا چاہتے ہیں؟"

شیر علی نے جواب دیا۔ "اگر بنارس سے گھوڑے مل سکتے تو میں کپڑا لاتا۔"

اور اگر کپڑا نہ ملتا تو آپ کیا لاتے؟

"کپڑا کیوں نہ ملتا۔ آپ دیکھیں تو سہی۔"

معظم علی نے کہا۔ "میں میسور سے ہاتھی لانے کے متعلق سوچ رہا تھا اور آپ بنارس سے کپڑا لاتے ہیں؟"

شیر علی نے اطمینان سے کہا۔ "میں آپ کو بتاؤں میں نے کپڑا کیوں خریدا؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"مجھے یہ ڈرتا کہ آپ کہیں کاروبار جاری رکھنے کا ارادہ نہ بدل دیں اور اس پرٹے کے متعلق آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ انشاء اللہ دو چار دن کے اندر اندر بک جائے گا اور میں کافی نفع ہوگا۔"

لیکن یہاں اسے خریدے کا کہن؟

آپ دیکھتے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ حریفی کھنڈ کی ایک اہم منڈی بن جائے گی۔

معظم علی نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "مرزا صاحب کی بیوی اور صاحبزادی مل گئی ہیں؟"

مبارک ہو مبارک ہو کہاں ملیں؟

آپ کو یقین نہیں آئے گا وہ اسی حریفی کی ایک کوٹھری میں رہتی تھیں۔

اب وہ کہاں ہیں؟

میں نے بلاخانہ انھیں دے دیلے۔

اگلے روز حریفی میں شہر کے پارہ فزوشن کا ایک ہجوم کھڑا تھا اور ایک دلال کپڑوں کے تھان نیلام کر رہا تھا۔

معظم علی نے ایک خوش رنگ ریشمی پرٹے کے دو تھان نکال کر صابر کو دیتے ہوئے کہا۔ "صابر یہ اوپر دے آؤ۔ اس کے بعد اس نے چند اور تھان نکال کر دلال رخاں کو دیتے ہوئے

کہا۔ "دلال رخاں یہ کپڑا گاؤں کے چودھری کے گھر لے جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ اسے بستی کے

عزیز اور سچے لوگوں میں تقسیم کر دیں۔"

تین دن کے اندر اندر معظم علی کا سارا مال فروخت ہو چکا تھا اور شیر علی خاں اسے صاحب

دکھانے کے بعد کہہ رہا تھا۔ "کیوں جی کیسی تہ بنی یہ تجارت، اگر ہم اطمینان سے یہ مال

فروخت کرتے تو اس سے دو گنا نفع ہوتا۔ اب بھی دس فیصدی نفع معمولی نہیں۔ اب

آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

معظم علی نے جواب دیا۔ میں نے فخر الدین کو کچھ دیا ہے کہ دو سو گھوڑے خرید کر

یہاں روانہ کر دیں۔ اس کے بعد میرا ارادہ ہے کہ ہم میسور سے باقی دانت، صندل اور

گرم مصالحہ خرید کر لائیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اگر بنارس آئے تو میں اسے آپ کے ساتھ حیدرآباد

بھیجوں لیکن پھر یہ سوچا کہ اس طرح دیر ہو جائے گی۔

شیر علی نے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں حیدرآباد سے گھوڑوں کے آنے سے پہلے

بنارس کا ایک اور پٹر کا آؤں :-

معظم علی نے جواب دیا :- مجھے یقین ہے کہ یہ پٹروں کا مسکہ میں بہت پریشان کرے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ چند دن آرام کریں۔ اس ٹر میں آپ کے لیے زیادہ کام کرنا ٹھیک نہیں۔

شیر علی نے جواب دیا :- مسہر دیتے میرے لیے سب سے بڑا آرام ہے میں صرف بیکار بیٹھ کر تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں :-



معظم علی کا کاروبار آٹے دن پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ سارا دن کاروبار کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا۔ اسے پڑھنے کا بھی شوق تھا اور دفتری کاغذات کے علاوہ کتابیں بھی اس کے کمرے میں انتہائی بے ترتیبی کی حالت میں پڑی رہتی تھیں۔ کسی نوکر کو کوئی کانڈیا کتاب ایک جگہ سے دوسری جگہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اسے فرصت ملتی تو وہ اپنی موجودگی میں نوکروں کو صفائی کا حکم دیتا لیکن چند دن بعد پھر وہی حالت ہو جاتی۔

ایک رات، دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر معظم علی اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اسے کمرے کی ہر چیز اپنی توقع کے خلاف دکھائی دی۔ کتابیں الماریوں میں بند تھیں۔ کاغذات ایک ترتیب کے ساتھ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر اور تکیے کا غلاف تبدیل ہو چکا تھا اور تمام غیر ضروری چیزیں کمرے سے غائب تھیں۔ معظم علی نے صابر کو آواز دی اور اپنے کاغذات اور کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ صابر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا :- جناب میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے چھوٹی بی بی کو منع کیا تھا لیکن وہ کہتی تھیں کہ تم بالکل جانور ہو۔ میری بڑی بے عزتی ہوئی۔ چھوٹی بی بی کہتی تھیں کہ تمہیں کوئی سلیقہ نہیں آتا اور تم نے کسی اصطبل میں پرورش پائی ہے۔ میں نے کہا سرکار خفا ہوں گے لیکن انہوں نے کہا تم جانور میں خود صفا کر دیں گی اور ہم

تمہارے سرکار سے بالکل نہیں ڈرتے :-

معظم علی نے مشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا :- اچھا جاؤ میرا کھانا لے آؤ! اور جب وہ تھوڑی دیر بعد کھانا لے کر آیا تو معظم علی نے اس کی طرف شرارت آمیز تبسم کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا :- اچھا صابر کیا کہتی تھیں چھوٹی بی بی تھیں :-

”جی وہ کہتی تھیں کہ تم بالکل جانور ہو اور تم نے کسی اصطبل میں پرورش پائی ہے۔

مجھے میں کوئی گھوڑا ہوں اور جناب انہوں نے آپ کے متعلق بھی بہت کچھ کہا تھا۔

”کیا کیا تھا؟“

”میں نہیں بتاؤں گا۔ آپ خفا ہو جائیں گے :-

”نہیں نہیں بتاؤ :-“

”جی وہ کہتی تھیں یہ رہنے کا کمرہ ہے یا کسی کباڑی کی دکان ہے :-“

اگلی صبح اپنے کمرے سے نکلنے وقت معظم علی کو شرارت سوچھی اور اس نے چند کتابیں الماری سے نکال کر بستر پر پھینک دیں۔ پھر مزے سے چند کاغذ اٹھائے اور ادھر ادھر بکھیر دیے لیکن جب وہ واپس آیا تو کمرہ اسی طرح سجا ہوا تھا۔

اس کے بعد وہ ہر روز یہ محسوس کرتا کہ فرحت اس کی غیر حاضری میں اس کے کمرے کا معائنہ کرتی ہے لیکن ایک شام وہ شہر کے کسی تاجر سے کوئی معاہدہ کرنے کے بعد واپس آیا تو اس کے کمرے میں کاغذات کے پرزے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ بستر کی چادر میں سونے لگی تھیں اور ایک کتاب جرات کو اس نے پڑھنے کے لیے نکالی تھی تکیے کے پاس اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔

صابر نے اگر کہا :- جناب کھانا لاؤں :-

معظم علی نے جواب دیا :- نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ چھوٹی بی بی آج بارہ بج چکے ہیں

”بی بی تھیں :-“

طیب نے جواب دیا۔ "تشویش کی کوئی بات نہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد ایک ہو جائیں گے۔"

رات کو دیر تک معظم علی کو نیند نہ آئی۔ صبح نماز کے بعد اس نے اوپر جا کر دستک دی۔

ت کی ماں نے دروازے پر آکر پوچھا: "کون ہے؟"

غلین بول چچی جان! فرحت کی طبیعت کیسی ہے؟"

عابدہ نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا: "بیاد فرحت"

اب بالکل ٹھیک ہے۔ تم نے رات کو خواہ مخواہ تکلیف اٹھائی۔"

"چچی جان" معظم علی نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا!"

"میں"

"ہاں بیٹا کہو!"

کچھ نہیں چچی جان۔ میں بہت پریشان تھا۔ "معظم علی یہ کہہ کر نیچے اتر آیا۔ اپنے کمرے

میں پہنچ کر اس نے میز کے سامنے بیٹھ کر قلم اٹھایا اور کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ چند

سطریں لکھنے کے بعد اس نے کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر دوسرے کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کاغذ لپیٹ کر اس کے اوپر ریشم کا دھاگہ باندھتے ہوئے کہا۔

"صابر! یہ اوپر چچی جان کو دے آؤ۔ دیکھو کہیں چھوٹی بی بی کے ہاتھ میں نہ دے دینا درجہ

تھوڑی خیر نہیں۔ وہ بہت گالیاں دیں گی تمہیں۔"

"نہیں جی میں کوئی بے وقوف تھوڑا ہوں۔"

"اور دیکھو جواب کے لیے دروازے کے باہر ٹھہر کر انتظار کرنا!"

"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے کورا کاغذ اور قلم دوات سامنے لے کر جانا چاہیے۔"

"نہیں نہیں جاؤ۔"

"نہیں۔ جی آج وہ سارا دن نیچے نہیں آتیں۔ صبح میں کھانا لے کر گیا تھا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ بڑی بی بی کہتی تھیں انھیں بخار ہے۔"

معظم علی نے کہا۔ "جاؤ دلا درخاں سے کہو فوراً طیب کو لے آئے۔ نہیں ٹھہرو میں خود جاتا ہوں۔"

قریباً ایک گھنٹہ بعد، معظم علی نے بالافانے کے ایک کمرے کے پاس جا کر آواز دی۔ "چچی جان! حکیم صاحب آئے ہیں!"

اندر سے آواز آئی۔ "حکیم صاحب! اچھا انھیں لے آؤ۔"

معظم علی کے اشارے پر طیب کمرے میں داخل ہوا اور وہ خود تذبذب کی حالت میں دروازے سے باہر کھڑا رہا۔

عابدہ نے آواز دی: "معظم علی! بیٹا اندر آ جاؤ باہر کہیں کھڑے ہو!"

معظم علی کمرے میں داخل ہوا۔ فرحت چادر میں اپنا منہ چھپائے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ معظم علی نے ایک کرسی اٹھا کر فرحت کی چارپائی کے قریب رکھتے ہوئے طیب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

طیب نے فرحت کی نیند دیکھی اور معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بخار بالکل معمولی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اتر جائے گا۔"

پھر اس نے اپنی جیب سے چاندی کی ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اس میں سے چار گولیاں نکال کر معظم علی کو دیتے ہوئے کہا۔ "ان میں سے دو گولیاں اسی وقت کھلاؤ۔"

دیکھو اور دواؤں ہی رات کے وقت۔ صبح تک اگر بخار نہ آتا تو اپنا نوکر میرے پاس بھیج دیکھیے گا۔"

تھوڑی دیر بعد چچی کے دروازے پر طیب کو فرحت کرتے ہوئے معظم علی نے کہا۔

"حکیم صاحب مریضہ کے متعلق کوئی تشویش کی بات تو نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

صابر کرنے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے بولا: "جناب اٹھیں بڑی بڑی بی بی آپ کو ادھر بلا رہی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ انہیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں انہوں نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہے، میں جواب لے جاتا ہوں لیکن انہوں نے اٹانجھ پر ہنسنا شروع کر دیا۔" بی بی کی کمرہ ہی تھیں یہ بالکل جانور ہے۔

تم نے چھوٹی بی بی کو تو خط نہیں دے دیا؟

نہیں جی۔ اب آپ بھی مجھے جانور سمجھنے لگ گئے ہیں کیا؟ میں نے اپنی طرف سے بہت احتیاط کی تھی لیکن بڑی بی بی نے خط پڑھنے کے بعد انہیں دکھایا۔ میں نے بہت کہا یہ خط چھوٹی بی بی کو نہ دکھائیے لیکن آج وہ بھی مجھ پر ہنس رہی تھیں: معظ علی کرے سے نکل کر بالائے خانے پر پہنچا تو فرحت کی ماں دروازے میں کھڑی آکر کا انتظار کر رہی تھی۔ حیا کے مارے معظ علی کے کمال اور ان سر نہ ہو رہے تھے۔

عابدہ نے کہا: "آؤ بیٹا اندر آ جاؤ!"

معظ علی جھپٹتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

عابدہ نے کہا: "فرحت دوسرے کمرے میں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔" اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیئے اور انکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: "بیٹا! فرحت تمہاری ہے وہ ہمیشہ تمہاری تھی۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں کئی دنوں سے تمہارے پیغام کا انتظار کر رہی تھی۔ سبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ زماں ہمیں ٹھکرا چکا ہے۔ میں سوچا کہ کئی مہینے کتنے کھنڈے بڑے سے بڑے فائدہ سے رشتہ حاصل کر سکتے ہو۔"

"چچی جان!" معظ علی نے اکبرہ ہو کر کہا: "مجھے صحت یہ ڈرتا تھا کہ اگر میں نے جلد بازی سے کام لیا تو آپ کہیں یہ نہیں کہیں کہ میں آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ آج بھی

جب میں خط لکھ رہا تھا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔"



آٹھویں روز لکھنؤ کے بڑے بڑے گھرانوں میں یہ چرچا ہو رہا تھا کہ ایک لاکھ پتی لڑکا نے اس بے سارا لڑکی سے شادی کر لی ہے جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ شہر سے باہر ایک بستی کی سرائے میں انتہائی مفلسی اور بے بسی کے دن گزار رہی تھی۔

فرحت رات کے وقت دھن کا لباس پہنے بستی کی عورتوں کے جوم میں بالائے خانے کے ایک کمرے میں بیٹھ گئی تھی۔ معظ علی دعوت دہر پر جمع ہونے والے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھا۔ جب بستی کی عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں تو فرحت کرسی گھسیٹ کر باہر کی طرف کھلنے والے درجے کے سامنے بیٹھ گئی۔ افق سے چاند نمودار ہو رہا تھا۔ فرحت نے اٹھ کر آہستہ سے درمیان کا دروازہ کھول کر ساتھ والے کمرے میں جھانکا۔ عابدہ کے کمرے کا چراغ بجھ چکا تھا۔ "امی جان!" اس نے آہستہ سے آواز دی لیکن جب ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ چاند اب بادل کے ایک سیاہ ٹکڑے کے پیچھے روپوش ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں بادل گزر گیا اور چاند کی دلفریب کرنیں پھر ایک بار فضا میں نور کے خولے بکھیر رہی تھیں۔ دروازے کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی فرحت نے مڑ کر دیکھا۔ معظ علی اس کے سپنوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فرحت کی نگاہیں جھک گئیں۔

معظ علی نے ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا: "فرحت میں تصور میں تمہاری ہزاروں تصویریں دیکھ چکا ہوں لیکن تم ان سب سے زیادہ حسین ہو۔"

فرحت نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"فطرتی مسکرا۔ تمہارے ہاتھ بھی خوبصورت ہیں۔"

تم نے ساری سے چہرے پر آنکس ڈال لیا اور اپنے ہاتھ اوڑھ لی کے اندر چھپا لیا۔

معظم علی نے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا: "فرحت! ادھر دیکھو چاند پر بادل آگیا ہے لیکن اس کی رعنائی اور دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب میں میر حبیب کی قید میں تھا تو اپنی کوششوں کے دروازے کی دراڑوں سے کبھی کبھی چاند کی جھلک دیکھا کرتا تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ شاید اس وقت تم بھی اپنے محل کے کسی دریچے میں کھڑی ہو کر چاند کی طرف دیکھ رہی ہو گی۔ پھر قید سے نکلنے کے بعد جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اب زندگی میں ہمارے رشتے ایک دوسرے سے مختلف ہو چکے ہیں تو میں نے چاند اور ستاروں کی طرف دیکھنا ترک کر دیا تھا لیکن تم میری لگا ہوں سے کبھی ادھل نہ ہو سکیں۔ معظم علی نے یہ کہہ کر اس کے چہرے سے نقاب اتار دیا۔ فرحت مسکرا رہی تھی لیکن اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

معظم علی نے کہا: "فرحت! تمہیں وہ دن یاد ہے جب میں تمہارے کتب خانے میں کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ کر بدحواس ہو گئی تھیں اور پھر جب مرہٹوں نے تمہارے محل پر حملہ کیا تھا اور میں تم پر برس پڑا تھا لیکن تم اس وقت بہت جھوٹی تھیں۔" فرحت نے جواب دیا: "یہ یادیں میری زندگی کا سب سے بڑا سراہ ہیں۔" معظم علی کا چہرہ اچانک منہمک ہو گیا اور وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ فرحت نے چند بار نظر بچا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا: "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" "کچھ نہیں۔" معظم علی نے سر نہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ پریشان ہیں؟" فرحت نے کہا۔

معظم علی نے جواب دیا: "پریشانیاں ہماری میراث ہیں۔" فرحت جب یہ بنگال کی فوج میں ملازم ہوا تھا تو اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ مفلس اور نادار لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ اگر تم اپنی کئی اسی طرح لاتے رہو گے تو اپنی بڑی کوئی بھر میں کیا دو گے۔ میں نے جواب دیا کہ میری رفیقہ حیات کا ہر ایک ایسا ملک ہو گا جو اندرونی اور بیرونی خطرات سے آزاد ہو۔ فرحت وہ قرار جو میں نے اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت

کے لیے اٹھائی تھی، اب ٹوٹ چکی ہے۔ اب اس ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس باشندے اپنی آئندہ نسلوں کو یہ پیغام دینے کے قابل ہوں کہ تمہاری عزت اور آزاد ہے۔ ہم تاریک رات کے مسافر۔ در خدا معلوم ہماری آخری منزل کیا ہوگی۔ مجھے موقع پر تم سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں لیکن کاش میں تمہیں مستقبل کے متعلق کوئی پیغام دے سکتا۔ فرحت فزع کر رہی تھیں کہ یہ کہیں اس وقت یا چند گھنٹے کے اندر اندر مرہٹوں کے خلاف ایک بڑی جنگ میں حصہ لینے کے لیے جا رہے ہوں تو کیا محسوس کر دو گی؟

فرحت نے جواب دیا: "میں — ہیں یہ کہوں گی کہ میں مرزا حسین بیگ بی بی اور آصف اور افضل کی بہن ہوں۔ میرے شوہر کو یہ خیال کیسے آیا کہ میں اسے اپنی قوم کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے سے منع کروں گی؟"

معظم علی نے کہا: "فرحت! مجھے تم پر فخر ہے۔" فرحت مسکرا رہی تھی اور معظم علی کو اس کی سکراٹ کا ایک ایک لمحوہ صافی کے مہینوں اور برسوں پر حاوی معلوم ہوتا تھا۔ وہ میدان جنگ کی کلفتیں اور قید کی اذیتیں بھول چکا تھا۔ مستقبل کے افق پر اٹھنے والی تاریک گھٹائیں اس کی نظروں سے ادھل جھل تھیں۔ اس کے سامنے صرف حال تھا۔ اس کی کائنات سمٹ کر اس کے کمرے کی چار دیواری تک محدود ہو رہی تھی، جس کا ہر گوشہ فرحت کی مسکراہٹوں سے منور تھا اور اس کمرے سے باہر کی دنیا پر مبنی اور مستقبل کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔

فرحت نے کہا: "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں:

"پوچھیے؟"

"لیکن میں نہیں پوچھتی۔ آپ برا مانیں گے۔"

"خدا کے لیے ضرور پوچھیے ورنہ مجھے بہت پریشانی ہوگی۔"

تیرھواں باب

معظم علی کا تجارتی کاروبار آئے دن وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی دولت اور مائیگی کے تذکرے زبان زد عام تھے۔ اس کے دروازے پر غریب اور نادار لوگوں کا آنا بندھا رہتا تھا۔ کھٹو کے امرار اور قجی افسر اس کا احترام کرتے تھے۔ حویلی کے اندر اس کا ایک شاندار کچی مکان اور مہمانوں اور نوکروں کے لیے کمرے تعمیر ہو چکے تھے۔ گھوڑوں کے اسٹبل اور گودام پس ہی ایک اور احاطے میں منتقل ہو چکے تھے۔ گھر میں معظم علی کو زندگی کا ہر آرام میسر تھا۔ پرانے دھم آہستہ آہستہ منزل ہو چکے تھے۔ فرحت کی وفات کے باعث زندگی کا ایک بھیاں تک غلام پر ہو چکا تھا۔ تاہم وہ بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتا تھا کہ مائیگی کی تاریکیاں ابھی تک اس کا پیچھا کر رہی ہیں اور یہ احساس کبھی ان تمام مسرتوں پر حاوی ہو جانا جو اسے فرحت کی وفات میں حاصل تھیں۔ وہ فرحت کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتا اور اپنے دل میں یہ کہتا: میری زندگی! یہ دنیا تھادی مسکراہٹوں کے لیے بنائی گئی ہے لیکن کاش ان مسکراہٹوں کی روشنی ان تاریکی پر دلوں کے پار جا سکتی جو ہمارے حال اور مستقبل کے درمیان حائل ہیں۔ وہ مائیگی کو بھول سکتا تھا لیکن حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ جی افسوس! اور طوفانوں کے ساتھ لڑنے میں اس نے اپنی جوانی کے بہترین دن گزارے تھے۔ وہ پھر ایک نئی شدت کے ساتھ مستقبل کے افق پر ظاہر ہو رہے تھے۔

مرشد آباد کے قید خانے سے نکلنے کے بعد اس کی ساری توجہ فرحت کی تلاش پر مرکوز

”اچھا یہ بتائیے کہ اس لڑکی کا نام کیا تھا؟“
”کونسی لڑکی؟“

”وہ جو آپ کو حیدر آباد کے راستے میں ملی تھی۔“

”شیخ فخر الدین کی بھانجی؟ اس کا نام بتائیں؟“

فرحت نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ ڈالتے ہوئے کہا: ”نہیں جناب

میں بڑی صاحبزادی کے متعلق پوچھتی ہوں۔“

”اس کا نام عطیہ تھا لیکن میں اس وقت اس کا خیال ایسے لیا؟“

”بس یوں ہی آگیا۔ اچھا یہ بتائیے کہ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی؟“

”میں نے کب کہا کہ وہ خوبصورت تھی۔ میں نے تو اسے اچھی طرح دیکھا ہی نہیں۔“

”لیکن آپ نے یہ تو کہا تھا کہ چھوٹی لڑکی کی شکل بہت پیاری ہے وہ بھی تو اس کی بہن تھی؟“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی خوبصورت ہو لیکن میں تو اس کا مطلب نہیں سمجھا۔“

فرحت کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کہنا:

”سوچ رہی تھی کہ اگر عطیہ کی جگہ میں ہوتی تو کیا کرتی۔ آپ کو حیدر آباد سے واپس آنے کے بعد

کبھی اس کا خیال نہیں آیا؟“

معظم علی نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ”فرحت میرے دل و دماغ میں اگر خیالات

کے لیے کوئی جگہ تھی تو وہ ہمارے تصور سے پُر ہو چکی تھی۔“

فرحت نے کہا: ”یہ عجیب بات ہے۔ میں نے جس دن سے اس لڑکی کے متعلق سنا

ہے، میرے دل میں بار بار خیال آتا ہے کہ کسی دن حیدر آباد جا کر اسے دیکھوں۔ نہ جانے

کیوں میں اپنے دل میں اس کے لیے ایک بہن کی شفقت محسوس کرتی ہوں۔“

معظم علی نے کہا: ”لیکن ہے میں کسی دن حیدر آباد جانا پڑے؟“

تھی، بلکہ قوم کے حال اور مستقبل کے مسائل اس کے لیے ایک ثانوی حیثیت اختیار کر چکے تھے لیکن فرحت کو پالنے کے بعد ان آندھیوں اور طوفانوں کا چہرہ اسے پہلے کی نسبت زیادہ بھیانک نظر آتا تھا وہ ایک درخت کی ٹھنڈی پھاؤں میں بیٹھ کر سارے باغ کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ وہ اودھ کی سرزمین کو ان انسانی بھیڑیوں سے بچانا چاہتا تھا جو کلاں کی طرح کرناٹک، دکن اور شمالی ہندوستان کے وسیع علاقوں کو اپنی شکار گاہیں بنا چکے تھے۔ اکبر خاں نے چھ ماہ قبل اسے جو آخری پیغام بھیجا تھا وہ یہ تھا کہ میں اپنے علاقے کے مجاہدین کے ساتھ نجیب الدولہ کی فوج میں شامل ہو چکا ہوں۔ ان دونوں ہم محاصرے کی حالت میں ہیں۔ دہلی سندھیا ہم پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے ملک کا انتظار کر رہا ہے لیکن نجیب الدولہ کو یقین ہے کہ احمد شاہ ابدالی اب کسی تاخیر کے بغیر ہماری مدد کو پہنچ جائیں گے۔

چند ہفتوں کے بعد احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر ملک کے طول و عرض میں مشہور ہو چکی تھی۔ پھر معظم علی قریباً ہر روز کھٹو کے امراء کی محفلوں میں اس قسم کی خبریں سن کر آتا تھا کہ آج احمد شاہ ابدالی نے دریائے سندھ عبور کر لیا ہے۔ لاہور کا مرہٹہ گورنروں سے پسپا ہو کر دلی بھاگ آیا ہے۔ احمد شاہ اب لاہور سے دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ راستے میں فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں روہیلہ سردار افغان لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور اب یہ لشکر مرہٹوں کو دلی کی طرف ہانک رہا ہے۔ دلی کے غدار وزیر عماد الملک غازی لکھنؤ نے فرخون کو خوش کرنے کے لیے دلی کے شہنشاہ عالم گیر شاہی اور اس کے وزیر اعظم نظام الدولہ کو قتل کر دیا ہے اور کسی اور شہزادے کو شاہ جہان ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھادیا ہے۔ دہلی سندھیا نجیب الدولہ کا چچا چھوڑ کر احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ ابدالی نے تراوٹی کے قریب مرہٹہ افواج کے ہرادل دستوں کو شکست دی ہے۔ افغان لشکر نے دریائے جمنہ عبور کر لیا ہے اور سمان پور کے قریب پہنچ گیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی اب دلی

کی طرف بڑھ رہے ہیں، نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں، سعد اللہ خاں، مولا سردار اور دوسرے روہیلہ اکابر اس کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ ابدالی نے دلی سے چھ میل دور لونی کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ دہلی کی افواج نے افغان پڑاؤ سے دس میل کے فاصلہ پر دریائے جمنہ کے دوسرے کنارے ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ ابدالی نے اچانک دریا عبور کر کے مرہٹہ لشکر کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ دہلی مارا جا چکا ہے اور اس کا مصیبتی جن کو جی زخمی ہونے کے بعد ہی سہی فوج کے ساتھ کوٹ پتلی پہنچ گیا ہے۔ راجپوتانہ سے مہاراجا ہلکری کی افواج جنگو جی کے ساتھ شامل ہو گئی ہیں۔ مرہٹہ لشکر نے روہیلوں کے علاقوں میں تباہی مچا دی ہے۔ مرہٹے بہادر گڑھ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کے مشہور جرنیل جہان خان نے چوہ گئے میں تنوایں ملینا کر کے اسکند آباد کے قریب مرہٹہ افواج کو عبرت ناک شکست دی ہے اور ان شاندار فتوحات کے بعد احمد شاہ نے موسم برسات گزارنے کے لیے علی گڑھ کے قریب ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔

ان حوصلہ افزا خبروں سے معظم علی اپنے سینے میں زندگی کی نئی دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا لیکن یہ خبریں جس قدر حوصلہ افزا تھیں اسی قدر دکن کے حالات تشویش کھاتے ہوئے تھے۔ حیدر آباد کے توپخانے کا مشہور کمانڈنٹ ابراہیم گاردی جس نے فرانسیسی جرنیل سے تربیت حاصل کی تھی، نظام سے بغاوت کر کے مرہٹوں کے ساتھ مل گیا۔ بالاجی نے گاردی کی خدمات حاصل کرتے ہی دکن پر حملہ کر دیا اور احمد نگر کے مشہور قلعے کے محافظ کی غدار سے فائدہ اٹھا کر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اس پر قبضہ کر لیا۔ احمد نگر کا قلعہ جہن جانے سے نظام کی فوج ایک اہم مستقر سے محروم ہو گئی تھی۔ دوسری طرف تنوایوں کی عدم ادائیگی کے باعث نظام کو اپنے سپاہیوں سے بناوٹ کا بھی خطرہ تھا۔ تاہم ان کے لیے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پیشوا نے سداسٹیو راؤ کی قیادت میں چالیس ہزار فوج بھیجی۔ اس کے علاوہ ابراہیم گاردی کو اس کے مشہور توپخانے اور پانچ ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ روانہ

کیا۔ ۳ فروری ۱۷۹۰ء کو پونا سے دوسریں دوراؤگیر کے مقام پر جنگ ہوئی۔ نعل بہادری سے لڑے لیکن گاردی کے توپخانے نے انھیں سخت نقصان پہنچایا۔ احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کے بعد دکن کے متعلق یہ خبر آئی کہ نظام نے سدیشو کے ساتھ انتہائی جنگ آمیز شرائط پر صلح کر لی ہے اور بیجا پور، بیدار اور اورنگ آباد کے گرد و نواح کے علاقہ جات اور دولت آباد، اسیر گڑھ، احمد نگر اور برہان پور کے قلعہ جات پر ان کا قبضہ تسلیم کر لیا ہے۔



پونا میں ابھی تک اوگیر کی فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ پیشوا کو داجی کی موت اور جنگجوئی اور ملہار راؤ ہکر کی شکستوں کی خبریں ملیں۔ عام حالات میں شاید داجی سدھیا کی موت کو مرہٹہ تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ سمجھا جاتا لیکن مرہٹے ایک طرف دکن میں نظام کی قوت مفوج کر چکے تھے۔ دوسری طرف چند ماہ قبل ان کی فتوحات کا سیلاب پشاور کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ گزشتہ کامیابیوں کے بعد مرہٹوں میں جو غرور اور خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی اس کے باعث یہ شکستیں پوری مرہٹہ قوم کی عزت اور دجا کا مسد بن گئیں اور جہاں شہر سے وہ فوجی قوت نمودار ہوئی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی بلونت راؤ مہمن ڈھیل، شمشیر بہادر، باجی راؤ کا بیٹا مستانی، نارو شکر وٹھل، شیو دو، ترمبک راؤ، پورن دھر، انتاجی، مانکیشور اور بیشوار دوسرے بڑے اور چھوٹے مرہٹہ سردار اپنی اپنی افواج کے ساتھ قومی توپن کا انتقام لینے کے لیے پیشوا کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ ابراہیم گاردی اپنے مشہور توپخانے اور وزیر تربیت یافتہ سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس عظیم فوج کی کمان اوگیر کے فاتح سدیشو راؤ (میاؤ جی) کو سونپی گئی اور اس کے ساتھ پیشوا نے اپنے جوان ولی عہد بشواش راؤ کو روانہ کر دیا۔ مرہٹہ لشکر ۱ مارچ ۱۷۹۰ء کو پٹ دڑ سے روانہ ہوا اور اورنگ آباد، برہان پور اور گوالیار کے راستے سفر کرنے کے بعد جون کو دیانے چنل کے کنارے پہنچ گیا۔ راستے میں جوں جوں یہ فوج شمال کی طرف بڑھتی گئی،

اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملہار راؤ ہکر جنگجوئی سدھیا، داجی، جسونت راؤ پھادڑ اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کے علاوہ لیٹوں اور پنڈاروں کے دستے ہر منزل پر اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ یہ صرف ایک فوج نہ تھی بلکہ پوری قوم کا فعال عنصر جمع ہو چکا تھا اور ان سب کا نعرہ یہ تھا کہ ہم افغانوں کو ہندوستان کی سرزمین سے نکال کر دم لیں گے۔

دلی کی طرف مرہٹہ لشکر کی رفتار بہت سست تھی۔ اس سے قبل مرہٹوں کی کامیابی کا راز ان کی سادگی اور تیز رفتاری میں تھا۔ سیوا جی کے زمانے میں مرہٹہ کیپ میں کسی عورت کا لانا بے لیاقتیاس سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی بھاری ساز و سامان بھی نہیں رکھتے تھے۔ اپنے ایک مرہٹہ سپاہی کے لوازمات گھوڑے، اسلحہ اور ایک توڑے تک محدود ہوتے تھے۔ اپنے لیے کھانا اور گھوڑے کے لیے چارہ راستے میں لوٹتے تھے۔ لیکن بھادجی کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ساتھ سامان رسد کی بیشمار گاڑیاں تھیں اور خیر بردار تھے۔ ریشمی خیمے ہاتھیوں پر لے ہوئے تھے۔ مرہٹہ سردار زرتار کے لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ چنل کے مقام پر بھرت پور کا حکمران راجہ سورج مل جاٹ اپنے لشکر سمیت مرہٹوں کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن بھادجی کی خود سری کے باعث راستے میں ہی مرہٹوں کے ساتھ اس کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ مرہٹے جولائی کے آخر میں دلی کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ ۲۰ اگست کو انھوں نے بغیر کسی شدید مزاحمت کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ بھادجی نے اپنی افواج کو تنخواہ دینے کے لیے لال قلعہ کو دنا اور دیوان عام کی چھت اور دیواروں میں لگی ہوئی چاندی ابدالی، لال قلعہ سے باہر بزرگان دین کے مزارات کو بھی لوٹنے سے دریغ نہ کیا۔ سورج مل جاٹ مرہٹوں کی اس حرکت سے خفا ہو کر واپس چلا گیا۔

موسم بہ سات کے دوران میں مہٹے دلی سے باہر پڑاؤ ڈال کر شہر اور اس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ اس عرصہ میں ابدالی بلند شہر کے ضلع میں انوب کے مقام

رسوم و آداب کے خلاف نہ ہو تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرا انتظار کرنے والے صاحب کون ہیں؟

داروغہ نے جواب دیا: "آپ کو نجیب الدولہ نے بلایا ہے۔"

"نجیب الدولہ یہاں ہیں؟"

"جی ہاں، وہ کل یہاں پہنچے تھے لیکن ابھی تک ان کی آمد کو صیغہ راز میں رکھا جا رہا ہے۔ اور میں آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ یہ بات اس محل سے باہر کسی پر فغان نہیں کریں گے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں لیکن میں حیران ہوں کہ انہیں میرے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

داروغہ نے جواب دیا: "میں سمجھتا ہوں کہ وہ آپ کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ انہوں نے یہاں پہنچنے ہی آپ کے متعلق پوچھا تھا۔"

معظم علی اپنے ذہن میں نجیب الدولہ کی سیما پانچویں شخصیت کی عجیب و غریب تصویریں لیے عمل کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ ایک قوی الجذہ آدمی جس کے چہرے سے ذہانت اور شجاعت مترشح تھی، اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھا اور مسافہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے آپ شاید اس بات پر پریشان ہوں کہ میں نے آپ کو یہاں آئے کی تکلیف کیوں دی ہے اگر مجھے بعض مجبور یوں کا احساس نہ ہوتا تو میں سیدھا آپ کے ہاں آتا۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ کی خدمت میں حاضر ہونا میرا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔"

تشریف رکھیے۔ مجھے اکبر خاں نے آپ کا پتا دیا تھا۔"

اکبر خاں کا نام سن کر معظم علی کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور اس نے

پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا اور دونوں فریق ذاب شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ لانے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔



معظم علی بلا ناغہ صبح کی نماز کے بعد گھوڑے کی سواری کیا کرتا تھا۔ ایک دن سواری کے بعد وہ اپنی حویلی میں داخل ہوا تو صحن میں ایک فوجی انسٹرکٹر شیر علی سے باتیں کر رہا تھا اور معظم علی کا ایک نوکر اس کے گھوڑے کی باگ تھامے چند قدم دور کھڑا تھا۔ شیر علی نے معظم علی کی طرف دیکھ کر فوجی انسٹر سے کہا: "لیجیے وہ لگے۔" معظم علی نے گھوڑے سے اتر کر فوجان انسٹر کے ساتھ مصافحہ کیا۔ انسٹر نے کسی تہید کے بغیر کہا: "جناب مجھے محل کے داروغہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کو اسی وقت محل میں طلب کیا گیا ہے۔"

معظم علی نے کہا: "میں وہاں طلب کیے جانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"جناب مجھے کچھ معلوم نہیں۔ داروغہ نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کو ساتھ لے کر آؤں۔"

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا: "اور اگر میں داروغہ کے حکم کی تعمیل نہ کروں تو؟"

فوجان انسٹر نے جواب دیا: "داروغہ نے آپ سے درخواست کی ہے حکم نہیں بھیجا۔"

"چلیے! " معظم علی نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد معظم علی اور فوجی انسٹر محل کی ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔

فوجی انسٹر نے کہا: "آپ یہاں تشریف رکھیے۔ میں داروغہ کو اطلاع دیتا ہوں۔"

معظم علی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور فوجی انسٹر باہر نکل گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد محل کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے گرجوئی سے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے

کہا: "آئیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

معظم علی نے داروغہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا: "اگر یہ بات اس محل کے

نجیب الدولہ کے سامنے کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ کہاں سے؟ مجھے اس نے کئی مہینوں سے کوئی اطلاع نہیں دی۔ میں اس کے متعلق بہت پریشان ہوں۔

”وہ احمد شاہ ابدالی کے پاس ہے اور گذشتہ چند ماہ وہ مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں بے حد مصروف رہا ہے اور میں اس کی طرف سے معذرت پیش کرتا ہوں۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”آپ کو اس کی طرف سے معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے جانتا ہوں اور شاید میں اس دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کو نہیں جانتا۔ میرے لیے اس کے متعلق صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ سلامت ہے۔“

نجیب الدولہ نے کہا: ”اس کا باپ میرا دوست تھا۔ میں اسے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔“

اس نے مرہٹوں کے خلاف جنگوں میں جرات و بہمت کی نہایت قابلِ فخر روایات قائم کی ہیں اور میں جب کبھی اسے شاباش دیتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ اس نے سب کچھ

آپ سے سیکھا ہے۔ آپ کے ساتھ میری ملاقات ایک مقصد کیلئے ہے اگر خاں مجھے سپاہیانہ زندگی سے آپ کی کنارہ کشی کی وجوہات بتا چکا ہے لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں

کہ احمد شاہ ابدالی نے جس جنگ کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ وہ اس ملک میں مسلمانوں کی اجتماعی بقا کی خاطر لڑی جائے گی۔ مرہٹے اب ہمیشہ کے لیے اس ملک کی تسکین کا فیصلہ کرنے کے

لیے اپنی پوری قوت کے ساتھ دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں آپ جیسے باشعور آدمی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اگر ہم نے اس جنگ میں شکست کھائی تو جو امیدی ہم نے

شمالی ہندوستان کے مستقبل کے متعلق وابستہ کی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ مرہٹے ایک بوچھلے ہیں اور ہمیں بھی ایک ہونے کی ضرورت ہے۔ میں نواب شجاع الدولہ کے پاس

احمد شاہ ابدالی کا لالچی بن کر آیا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔ رد سیکھند کے تمام مردار احمد شاہ ابدالی کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں لیکن ہمیں اپنے

سپاہیوں کو ذرا تربیت دینے کے لیے آزمودہ کار فوجوں کی ضرورت ہے۔“

معظم علی نے کہا: ”اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں کسی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں تو میری رضا کا لانا خدمات حاضر ہیں اور مجھے اس بات کی ندامت ہے کہ میں اکبر خاں

کی طرح بن جائے۔ آپ کی خدمت میں حاضر کیوں نہ ہوں؟“

محل کا واروغہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا: ”عالیجاہ حضور نواب صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

نجیب الدولہ نے جواب دیا: ”میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

”نہیں عالیجاہ خود تشریف لارہے ہیں۔ واروغہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور معظم علی نے اٹھ کر کہا: ”تو میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں ایک ہفتہ کے اندر اندر

احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”نہیں ٹھہریے؟“

”لیکن نواب صاحب تشریف لارہے ہیں؟“

نجیب الدولہ نے کہا: ”بیٹھ جلیے! نواب صاحب سے آپ کا تعارف ضروری ہے۔“

نواب اودھ اپنے شاہزادہ باہا میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور نجیب الدولہ اور معظم علی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ شجاع الدولہ اپنے مہمان کے ساتھ ایک اگلی کو دیکھ کر چند تینے تہذیب کی حالت میں کھڑا رہا۔ نجیب الدولہ نے کہا: ”جناب یہ معظم علی خاں ہیں۔“

کھنڈ میں پناہ لینے سے پہلے یہ بنگال کی فوج میں ملازم تھے۔ ان کا ایک ہونہار شاگرد احمد شاہ ابدالی سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اور میں ابھی ان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں اپنے

سپاہیوں کو تربیت دینے کے لیے آپ کی خدمات کی ضرورت ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے میری درخواست قبول کر لی ہے۔“

شجاع الدولہ نے کہا: ”تشریف رکھیے۔ ایک اچھے سپاہی کے لیے میری فوج میں

میں جگہ تھی۔ کھنڈ میں آپ کے کیا مشاغل ہیں؟“

”میں تجارت کرتا ہوں۔“

شجاع الدولہ نے نجیب الدولہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”آپ انھیں کب سے جانتے ہیں؟
روہیکھنڈ کا ایک نوجوان مرد اپنی عمر کا کچھ حصہ ان کے ساتھ گزار چکا ہے اور اس
کی بدولت میں غائبانہ طور پر ان سے متعارف ہو چکا تھا۔“
شجاع الدولہ چند ثانیہ خاموش رہا، معظّم علی نے اس مصل میں اپنی موجودگی کو قائل معذرت
بکھتے ہوئے اٹھ کر کہا: ”اب مجھے اجازت دیجیے۔“

”بہت اچھا! اگر مجھے وقت ملا تو جانے سے پہلے آپ کے ساتھ ایک اور ملاقات کی
کوشش کر دوں گا لیکن اگر ممکن نہ ہو تو انشا اللہ ہماری ملاقات احمد شاہ ابدالی کے کیپ
میں ہوگی۔“

نجیب الدولہ نے اٹھ کر معظّم علی کے ساتھ مصافحہ کیا لیکن شجاع الدولہ نے کرسی
پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھادیا۔ معظّم علی دروازے کی طرف بڑھا لیکن کچھ سوچ کر اچانک رک گیا
پھر اس نے مڑ کر شجاع الدولہ کی طرف دیکھا اور کہا: ”جناب اگر یہ گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض
کرنا چاہتا ہوں۔“
”کیسے؟“

”مجھے یہ معلوم نہیں کہ نجیب الدولہ اپنی ہم میں کہاں تک کامیاب ہوں گے، اور
احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دینے کے متعلق آپ کا آخری فیصلہ کیا ہوگا میں صرت یہ جانتا ہوں کہ
ہندوستان کا کوئی مسلمان، اگر اس نے خودکشی کا ارادہ نہیں کر لیا ہے۔ اس جنگ میں غیباںدا
نہیں رہ سکتا۔ اگر خدا خواستہ اس ملک کے مسلمانوں کی اجتماعی بے بسی کے باعث احمد شاہ ابدالی
کو شکست ہوگی تو شمالی ہند میں ہمارا آخری دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا۔ مرہٹوں نے صرف
دلی پر قبضہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ پشاور سے کابل اور غزنی تک اپنی فتوحات کے چیم ہرانے
کی نیت سے میدان میں آئے ہیں۔ اگر کسی میدان میں انھیں فیصلہ کن شکست زدگی نہ ہو تو وہ

دن دور نہیں جب دلی کی طرح مکھنوں کی گلیوں اور بازاروں میں بھی ان کے گھوڑے دوڑ
رہے ہوں گے۔ مکھنوں میں اس قسم کی افواہیں گشت کر رہی ہیں کہ مرہٹوں نے آپ کو
جنگ سے علیحدہ رکھنے کے لیے دلی میں اپنے کٹھ پتلی حکمران کی وزارت کی پیش کش کی ہے
اور آپ.....!“

شجاع الدولہ نے سراپا احتجاج بن کر کہا: ”یہ جھوٹ ہے اور مرہٹے مجھے بیوقوف نہیں
بنا سکتے۔“

معظّم علی نے کہا: ”میری معذرت قبول فرمائیے لیکن عوام کا اعتماد بحال کرنے کے لیے
اس قسم کی افواہوں کی تردید کی اشد ضرورت ہے اور تردید کی بہترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ اپنی
افواج کو مرہٹوں کے خلاف کوچ کی تیاری کا حکم دیں۔“

شجاع الدولہ نے جواب دیا: ”مجھے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے آپ کے مشوروں کی
ضرورت نہیں۔“

”جناب مجھے معلوم ہے کہ میں مشورہ دینے کا اہل نہیں لیکن میں آپ کے کانوں
تک اس قوم کی زیاد پسینا چاہتا ہوں جس کی شرک تک ایک ایسے دشمن کی توارپسین
چکی ہے جو بدلتا انسانیت کے الفاظ سے نا آشنا ہے۔ میرے الفاظ بیشک
تجربہ ہیں لیکن آپ کو میرے خلوص پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔“
معظّم علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔



مقوڑی دیر بعد معظّم علی گھوڑے پر سوار اپنے گھر کا رخ کر رہا تھا۔ شہر کے پردون بازاروں
اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اسے اپنے گرد و پیش کا احساس تک نہ تھا۔ وہ کوسوں دور کسی
میدان میں ان افواج کے میلوں تک پھیلے ہوئے پڑاؤ دیکھ رہا تھا جو ہندوستان کے مستقبل کا
بسلہ کرنے والی تھیں۔ وہ بڑے دالوں کے نعرے، زنجیروں کی چیخ پکار، توپوں کی دھندلچھا

بندوقوں کے دھماکے اور تواروں کی جھنکار سن رہا تھا، اسے ہر نگاہ تک لاشوں کے انبار نظر آرہے تھے۔ پھر آگ اور دھواں کے طوفانوں سے نکل کر وہ اس مکان میں پہنچ چکا تھا، جہاں زندگی اپنی تمام عنایوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ فرحت اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "میری زندگی! میں آگیا ہوں۔ خدانے ہمیں نوح دی ہے۔ ہم ان درندوں کے دانت توڑائے ہیں جو اس ملک میں انسانیت کے لیے ایک خطرہ عظیم بن چکے تھے۔ میرے پیچھے وہ فوج آ رہی ہے جس کے سپاہی مرہٹوں کی سطوت کے پرچم اپنے پیروں کے درندہ چکے ہیں۔ اب یہ مجاہدان فرنگی تاجروں کی چیرہ دستیوں سے ہمیں نجات دلائیں گے جنہوں نے بنگال میں ہمدلی عورت اور آزادی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس ملک میں انسانیت دوبارہ جنم لے رہی ہے۔ اب ہمدلی منزل مرشد آباد ہے۔ ہم بہت جلد اس وطن کی مٹی کو آنکھوں سے لگائیں گے جہاں ہمارے شہیدوں کا خون گرا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد معظم علی اپنے گھر میں داخل ہوا تو وہاں ایک کمرے میں فرحت اور اس کی ماں کے علاوہ دو اجنبی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ معظم علی جلدی سے واپس مڑا اور دھڑک کر کمرے میں جا بیٹھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد فرحت اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ معظم علی نے کہا: "فرحت مجھے معلوم نہیں تھا کہ ذراں تمہاری سیلیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے برا تو نہیں مانا؟"

فرحت مسکرائی: "وہ میری سیلیاں نہیں تھیں۔ انہیں امی جان نے بلایا تھا اور جلتے جلتے آپ کو ایک خوشخبری دے گئی ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ ہمارے گھر میں ایک مہمان تشریف لانے والے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "واہ یہ خوشخبری تو میں کچھلے ہفتے سن چکا ہوں۔"

ذحت مسکرائی: "امی جان کو اصرار ہے کہ شہر کی ہر تجربہ کار عورت باری باری مجھے دیکھنے

کے لیے آئے۔ کل پڑوس کی کسی عورت نے ان عورتوں کا پتہ دے دیا تھا اور امی جان نے آج صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی صابر کو ان کی تلاش میں بھیج دیا تھا۔ معظم علی فرحت کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے خیالات کہیں اڑتھے۔ فرحت نے کہا: "آج آپ پریشان نظر آتے ہیں خیر تو ہے! دلا درخاں کتا تھا کہ آپ کو شجاع اللہ نے بلایا تھا۔"

"نہیں مجھے نجیب الدولہ نے بلایا تھا۔ وہ کل سے لکھنؤ میں ہیں، فرحت! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے ننھے مہمان کی صورت دیکھنے سے پہلے میں گھر سے باہر نہیں جاؤں گا۔"

فرحت نے کہا: "لیکن آپ اگر کہیں جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔"

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: "فرحت آج میں اس بات پر ندامت محسوس کر رہا ہوں کہ میں ان جنگوں سے غیر حاضر رہا ہوں جو ہماری قوم کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی ہیں۔ تم سن چکی ہو کہ مرہٹوں کا سیلاب اب دلی پہنچ چکا ہے۔ احمد شاہ ابدالی ہمارا نجات دہندہ بن کر آیا ہے اور اسے ہر اس انسان کے تعاون کی ضرورت ہے جو اس ملک کے مسلمانوں کے متعلق سوچنے کا شعور اور ان کی بقا کے لیے توار اٹھانے کی ہمت رکھتا ہو۔ فرحت نے کہا: "میں چند دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ آپ کوئی اہم فیصلہ کرنے والے ہیں اور کچھلے ہفتے جب آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ آپ اب چند مہینے لکھنؤ سے باہر نہیں جائیں گے تو بھی مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ آپ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اگر آپ میری خاطر اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کریں گے تو میں سمجھوں گی کہ میں آپ کی رفیقہ حیات بننے کی اہل نہ تھی۔"

آٹھ دن بعد معظم علی ایک سپاہی کا لباس پہنے فرحت کے سامنے کھڑا تھا۔ فرحت

کے چہرے پر ایک منوم مسکراہٹ تھی۔ معظم علی نے کہا: میں اپنی زندگی میں ایسی جگہیں دیکھا ہوں جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بے معنی تھیں لیکن اس دفعہ میں ایک ایسی جگہ میں صحت لینے کے لیے جا رہا ہوں جس کے نتائج بہت دور رس ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں شمال مغرب کے علاقے ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری دفاعی حصہ ثابت ہوں گے اگر ہم مرہٹوں کو شکست دے کے قویہ سیلاب عظیم کسی دن ملک کے پار پشاور اور غزنی تک پہنچ جائے گا اور مسلمانوں کی حالت اس ملک کے مشددوں سے بدتر ہوگی۔ فرحت میں اپنی شہرت اور ناموری کے لیے نہیں بلکہ قوم کی بقا کے لیے جنگ میں حصہ لینے جا رہا ہوں یہ جنگ اس ملک کی تاریخ کی عظیم ترین جنگ ہوگی اور اس میں حصہ لینے والے ہزاروں سپاہی ایسے ہوں گے جن کی لاشیں دشمن کے گھوڑوں کے پیروں سے روندی جائیں گی اگر میں واپس نہ آیا تو یہ سمجھنا کہ میرا مقصد میری ذات سے بلند تھا اور جو کچھ ہمارے ہاں پیدا ہوگا تم کسی دن اسے یہ بتا سکو گے کہ تمہارا باپ ان ہزاروں گنم سپاہیوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اپنی آنے والی نسلوں کی عزت اور آزادی کی قیمت اپنی جانیں دے کر ادا کی تھی۔

فرحت کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے، اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے معظم علی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی آواز میں خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

مقوڑی دیر بعد جب وہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو فرحت اور اس کی ماں بالائی نزل کے درپے میں کھڑی نیچے دیکھ رہی تھیں۔ جب معظم علی اور اس کے ساتھی حویلی سے باہر مل گئے تو فرحت بے اختیار عابدہ کے ساتھ پلٹ گئی: امی جان! اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: دعا کیجئے کہ خدا انہیں فتح دے۔



موسم برسات ختم ہو چکا تھا۔ بھاؤ نے نار و شکر کو سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ دلی کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر پیشہ قدی کی اور دلی سے اسی میل دور شمال کی طرف جانا کے کنارے افغانوں کے مشہور قلعہ کنج پورہ پر حملہ کر دیا۔ سجاہت خاں دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس قلعے کی حفاظت پر متعین تھا لیکن مرہٹوں کے سیلاب کے آگے اس کی پیش نہ گئی۔ انھوں نے گاردی کے کوچانے کی گولہ باری کے بعد طینا کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ سجاہت خاں اور سرسند کے سابق گورنر عبدالصمد خاں کے علاوہ ہزاروں سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس قلعے سے مرہٹوں کو اسلحہ اور بارود کے علاوہ رسد کے وہ ذخائر دستیاب ہوئے جو احمد شاہ ابدالی کی فوج کے لیے جمع کیے گئے تھے۔

دریائے جونا طینا کے باعث ناقابل عبور تھا اور احمد شاہ ابدالی انتہائی رنج و ملال کے ساتھ دریائے دوسرے کنارے مرہٹوں کے ہاتھوں اپنے بہترین ساتھیوں کے قتل عام کی خبریں سن رہا تھا لیکن جب مرہٹے کنج پورہ کے خزانے لوٹنے کے بعد دوسرے کی خوشیاں منا رہے تھے، احمد شاہ ابدالی دلی سے بیس میل شمال کی طرف باغپت کے قریب جانا کلا۔ کشیتوں کے بغیر وہاں بھی دریائے جونا کو عبور کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ فوج کے افسر اور سپاہی دریا کی خستگیوں میں دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے لیکن کسی کو امیر لشکر کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حکم سے توپیں ہاتھوں پر لا دی گئیں اور سواروں کے دستے دریائے کنارے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ پھر امیر لشکر نے "اللہ اکبر" کہہ کر گھوڑے کو اٹھار لگائی اور دریا میں کود پڑا۔ اس کے ساتھ ہی نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، نصیر خاں بلوچ، مراد خاں ایرانی، برخوردار خاں، شاہ دلی خاں، جہان خاں اور دوسرے افغان ایرانی، بلوچ اور دہلی سرداروں نے اپنے گھوڑے دریائے ڈال دیئے اور پھر ان کی آن میں پوری فوج دریا کی موجوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

مقوڑی دیر بعد جب یہ لشکر دریا کے پار پہنچ چکا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے عقب

تھا اور اب وہ یہاں سے چھ کوس دور دشمن کی ایک چوکی کا صفایا کرنے جا رہا ہے، پھر یہ علاقہ بالکل محفوظ ہو جائے گا اور ہم اپنی پیش قدمی جاری رکھ سکیں گے۔

اگلی رات مرہٹہ چوکی کے چند سپاہی جو دو میلہ دستوں سے جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے، بھادرجی کو یہ بتا رہے تھے کہ ابدالی کے لشکر نے اچانک دریا عبور کر کے بھاری چوکی کا صفایا کر دیا ہے۔

بھادرجی نے مرہٹہ سرداروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنی فوج کو پانی پت کی طرف ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شہر کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی پانی پت کا رخ کیا اور مرہٹہ کیمپ سے آٹھ میل دور پڑاؤ ڈال دیا۔ مرہٹوں نے ابراہیم گارڈی کی ہدایت کے مطابق شہر اور اپنے کیمپ کے گرد ساٹھ فٹ چوڑی اور بارہ فٹ گہری خندق کے پیچھے مٹی کے بلند پستے پر جگہ جگہ توپیں نصب کر دیں۔ بھادرجی کو اسید پٹی کر اس کی پندارہ فوج احمد شاہ ابدالی کے سرداروں کے راستوں پر حملہ کر کے اسے حملے پر مجبور کر دے گی لیکن ابدالی، مرہٹہ پر سالار کی نسبت کہیں زیادہ تجربہ کار اور دور اندیش تھا۔ وہ دشمن کی خواہش کے مطابق اپنی فوج کو اس کی توپوں کے سامنے لانیے پر تیار نہ ہوا۔ اس نے ارد گرد کے جنگلات سے بنیاد درخت کٹوائے اور پڑاؤ کے ارد گرد کھڑی کے کھمبوں کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ ابدالی کے اس اقدام سے مرہٹے ایک غیر متوقع صورتِ حالات کا سامنا کر رہے تھے۔ وہ اپنے بھاری توپخانے کو ایک فیصلہ کن حربہ سمجھتے تھے لیکن بھاری ساز و سامان سے لیس ہونے کے باعث بدلے ہوئے حالات کے مطابق جنگ کا کوئی نیا نقشہ تیار کرنے کے قابل نہ تھے۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے خندق کھودی تھی کہ احمد شاہ ابدالی ایک طوفان کی طرح آگے بڑھے گا اور ان کی توپیں خندق کے ارد گرد افغان سپاہیوں کے ڈھیر لگا دیں گی لیکن اتنی بڑی تیاری کے بعد انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دشمن کیا سوچ رہا ہے! افغان لشکر اگر کھلے میدان میں نکل کر حملہ کرتا تو مرہٹے ابدالی کے ہر سار کے مقابلے میں کم از کم پانچ

سے گھوڑوں کی ٹاپ سنا دی۔ ابدالی کی فوج کے چند دستوں نے کسی غیر متوقع حملے کے پیشِ نظر آگے بڑھ کر صفیں باندھ لیں۔ چند تلیے بعد میں سواروں کا دستہ نمودار ہوا۔ اگلی صفت سے کسی نے بلند آوازیں نہ کیں یہ ہمارے ساتھی ہیں انھیں آنے دو۔ اکبر خاں اور عظم علی ان سواروں میں سب سے آگے تھے وہ اپنے گھوڑوں سے ہڑک بھاگتے ہوئے لشکر کی صفوں میں گھس گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ نجیب الدولہ، حافظ رت خاں اور دہلیکھنڈ کے دوسرے سرداروں سے باتیں کر رہے تھے۔ معظم علی کہہ رہا تھا: یہاں سے صرف چھ کوس کے فاصلے پر مرہٹوں کی ایک چوکی ہے اور اس چوکی کا صفایا کرنے کے بعد یہ علاقہ ہمارے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ وہاں سپاہیوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں۔ مرہٹے اس وقت دھرو کا جٹ منارہے ہیں۔ اگر میرے ساتھ چند تیز رفتار دستے بھیج دیئے جائیں تو میں دوپہر سے پہلے پہلے ان کا صفایا کر سکتا ہوں۔

حافظ رحمت خاں نے کہا: ہمیں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ چلیے آپ ہماری رہنمائی کریں۔

ہمارے گھوڑے تھکے ہوئے ہیں۔ یہ کہہ کر معظم علی نے ایک فوجان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

فوجان نے کہا: لیکن میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔

معظم علی نے اسے بازو سے کھینچ کر گھوڑے سے اتارتے ہوئے کہا: تم سن چکے ہو کہ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

اکبر خاں نے اس کی تقلید کی اور اپنے قبیلے کے ایک سپاہی کا گھوڑا پکڑ لیا۔

تھوڑی دیر بعد کوئی چار سو سوار لشکر کی صفوں سے نکل کر گرد و غبار کے بادلوں میں روپوش ہو رہے تھے اور نجیب الدولہ، احمد شاہ ابدالی سے کہہ رہا تھا: عالیجاہ! اس کا نام معظم علی ہے، اس نے دو دن قبل اس علاقے میں دشمن کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے دریا عبور کیا

سوار لا سکتے تھے۔ پھر اگر پڑاؤ میں مرہٹہ سرداروں کے ساتھ ان کی بیویاں نہ ہوتیں تو ان کے بے پسا ہو کر جنگ کے لیے کوئی بہتر جگہ تلاش کرنا نسبتاً آسان ہوتا۔ اب ان کے لیے پڑاؤ سے باہر ہر جگہ غیر محفوظ تھی۔ اس کے برعکس احمد شاہ ابدالی کی فوج ہر وقت حالات کے مطابق نقل و حرکت کر سکتی تھی۔ ابدالی کے سپاہی بھاری توپوں کی بجائے ایسے نیرزدن تواردوں، ہندو قتل اور گھوڑوں پر بھر دوسرے دیکھتے تھے۔

فریقین کے کیمپوں کے درمیان قریباً آٹھ میل کے خلا میں روزمرہ انفرادی شجاعت کے واقعات دیکھے جاتے تھے کبھی کوئی مرہٹہ ماتھے پر تک لگا کر اپنے پڑاؤ سے نکلتا اور مسلمانوں کے پڑاؤ کے سامنے گھوڑا رک کر کسی افغان، کسی ایلانی، یا کسی بلوچ کو مقابلے کی دعوت دیتا۔ اسی طرح افغان فوج کے جواہر دھوڑے دوڑاتے ہوئے اپنے پڑاؤ سے نکلتے اور مرہٹہ کیمپ کی خندق کے پل کے قریب رک کر انہیں دعوت مبارزت دیتے ابدالی کے کیمپ میں ایک فوجان کی زہ دلی اور جرأت کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں۔ وہ ہر روز ایک نئے بھین میں اپنے کیمپ سے نکلتا اور دشمن کے دوچار سو رما دلی کا غرور خاک میں ملا کر واپس آتا۔ ابدالی کے جاناؤ اسے کبھی افغان، کبھی بلوچ، کبھی منڈل اور کبھی روہیلہ سپاہی کے لباس میں دیکھتے اور داد و تحسین کے نعرے بلند کرتے۔ چند شاذ و معرکوں کے بعد وہ نصیر خاں، ح سہ بپ پٹکا، ملک جہان خان سے ایک توار، شجاع الدولہ سے ایک گھوڑا اور نجیب الدولہ سے ایک بندوق بطور انعام حاصل کر چکا تھا۔

یہ فوجان اکبر خاں تھا۔ ایک دن احمد شاہ ابدالی نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا اور کہا: "بیٹا میں تمہارے متفق بہت کچھ سن چکا ہوں اور تم اپنے آپ کو میری طرف سے بہترین انعام کا مستحق ثابت کر چکے ہو۔ تمہاری کوئی ایسی خواہش ہے جو میں پوری کر سکا ہوں؟"

اکبر خاں نے انسانی سلطوت و جبروت کے اس پیکر عجم کی طرف دیکھا اور محبت

اور اطاعت کے جذبات سے مغلوب ہو کر گردن جھکا لی۔

احمد شاہ ابدالی نے کہا: "بیٹا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" اکبر خاں نے گردن اٹھائی۔ اس کی چمک دار آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا: "عالیجاہ! میری صرف ایک خواہش ہے اور وہ آپ کے سوا کوئی پوری نہیں کر سکتا۔"

عالیجاہ! میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مرہٹے دوبارہ اس سرزمین میں پاؤں نہ رکھیں۔ اور ان الفاظ کے ساتھ اکبر خاں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ احمد شاہ ابدالی نے کہا: "بیٹا خدا مجھے ہمت دے۔ تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ اب میں تمہیں ایک حکم دیتا ہوں اور وہ یہ کہ آج کے بعد تمہیں تنہا دشمن کے مقابلے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مرہٹوں کا یوم حساب شروع ہونے والا ہے اور میں تمہیں اس دن کے لیے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاش اس ملک میں چند اور فوجان تم جیسے ہوتے؟"

اکبر خاں نے کہا: "عالیجاہ! میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جس کا بچپن میرے بچپن سے اور جس کی جوانی میری جوانی سے بہتر تھی اور جواب بھی میرے لیے باعث رشک ہے۔"

"اور وہ کون ہے؟"

"عالی جاہ! وہ چھاپا مار رہید دستوں کا سالار ہے اور میں نے سب کچھ اسی سے سیکھا ہے۔"

۱۹ نومبر کو گاروی نے اپنی پیادہ سپاہ کے ساتھ حملہ کیا لیکن اسے شدید نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہونا پڑا ہوا۔ تین دن بعد سندھیا نے یکے بعد دیگرے دو حملے کیے

لیکن اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ ۷ دسمبر کو رد سہیلوں نے جوابی حملہ کیا اور ان کی جھڑپ بونت راؤ میہنڈیل کے دستوں کے ساتھ ہوئی۔ سخت لڑائی کے بعد بونت راؤ مارا گیا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔ روہیلوں نے شکست خوردہ دستوں کا تعاقب کیا اور مرہٹہ کیمپ میں داخل ہو گئے اور شام تک تباہی چانے کے بعد واپس چلے آئے۔

قریباً اڑھائی ماہ فریقین کے درمیان اس طرح کی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ اس عرصہ میں دونوں فوجوں کے سامنے سپاہیوں کے لیے رسد اور گھوڑوں کے لیے چارے کی فراہمی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ مرہٹہ فوج کو زیادہ تر رسد دلی کے قلعہ نارو شکر کی طرف سے پہنچتی تھی۔ بنجیب الدولہ نے امیر شکرے مشورہ کرنے کے بعد معظم علی کی قیادت میں اپنی فوج کا ایک حصہ مرہٹوں کی رسد و ملک کے راستوں پر چھاپے مارنے کے لیے بھیج دیا۔ چند دن کے بعد یہ چھاپہ مار دستے دلی اور پانی پت کے درمیان آمد و رفت کے تمام راستے بند کر چکے تھے اور مرہٹہ فوج قحط کا سامنا کر رہی تھی۔

افغان فوج کو زیادہ تر رسد روہیلکنڈ کے علاقوں سے ملتی تھی۔ بھادو صاحب نے بنجیل کھنڈ میں گو بند پنٹھ کو صورت حالات سے باخبر کیا اور اس نے بارہ ہزار تیرہ سواروں کے ساتھ روہیلکنڈ پر یلغار کر دی۔ چند دن میں وہ رد سہیلوں کے کئی علاقے تباہ و برباد کرنے کے بعد میرٹھ تک پہنچ چکا تھا اور افغان افواج کو خوراک کی ترسیل بند ہو چکی تھی۔ اب مرہٹہ کیمپ کی طرح افغان فوج کے پڑاؤ میں بھی قحط کے اثرات محسوس کیے جا رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے جنرلیوں نے اسے مشورہ دیا کہ ہمیں یا تو فوراً مرہٹوں پر حملہ کر دینا چاہیے یا یہاں سے پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔ دونوں ہمیں چند دنوں تک ایک خطرناک قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ احمد شاہ ابدالی کا جواب یہ تھا: ”تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ انتظار کرو اور دیکھو، ہمارے مقدس تخت سے پسپائی نہیں“ ۱

احمد شاہ ابدالی کی جوابی کارروائی یہ تھی کہ اس نے مرہٹوں کے کیمپ کے گرد اپنا گھیرا

تنگ کرنا شروع کر دیا اور اپنے اور دشمن کے پڑاؤ کے درمیان پانچ ہزار سپاہیوں کی ایک اور چوکی قائم کر دی اور وہاں اپنے لیے سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا نیمہ نصب کر دیا۔ یہ چھوٹا سرخ خیمہ اس عظیم فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا جو اپنی تلواریں نوک سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا صفحہ لکھنے والی تھی۔ احمد شاہ ابدالی دن بھر گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی بیرہنی چوکیوں کا معائنہ کرتا اور لمبا اوقات اسے ایک دن میں پچاس ساٹھ میل سواری کرنی پڑتی۔ رات کے وقت اس کی اگلی چوکی کے سپاہی دشمن کے پڑاؤ تک پہنچ جاتے اور باقی فوج کے کئی دستے مرہٹوں کی رسد و ملک کے راستوں پر چھاپے مارتے۔

۷ دسمبر کو احمد شاہ ابدالی کے ایک جنرل عطار خاں کی قیادت میں سواروں کی ایک فوج نے ایک دن میں پچاس میل یلغار کر کے گو بند پنٹھ کو جالیا اور بارہ ہزار مرہٹوں کے اس لشکر کو تیغ کر ڈالا جو کئی دن سے رسد و ملک کے راستوں پر حملے کر کے افغانوں کو پریشان کر رہا تھا۔ چند دن بعد معظم علی اور اکبر خاں نے رات کے وقت مرہٹہ کیمپ کے ان دستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو گھوڑوں کے لیے چارہ تلاش کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔

۸ جنوری ۱۷۶۱ء کو دلی سے ایک قافلہ جو مرہٹہ فوج کے لیے رسد اور تنخواہیں لے کر آ رہا تھا۔ افغان چھاپہ مار دستوں کے نزعے میں آ گیا اور اس قافلے کے بہت کم آدمی ایسے تھے جنہیں افغان سواروں نے بچ نکلے کا موقع دیا۔ اب مرہٹہ کیمپ پر بیچارگی، بے بسی اور خوف چھایا ہوا تھا۔ قریباً چار لاکھ انسان ایک ایسے پڑاؤ میں بری طرح گھرے ہوئے تھے جہاں دشمن کا انتظام ناممکن تھا۔ سیکیڑوں آدمی روزانہ بھوک سے مر رہے تھے اور سیکیڑوں غلامت اور تعفن کے باعث پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہو رہے تھے۔ وہ فوج جو اپنی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے نش میں غزنی تک پہنچنے کا غرور لے کر نکلے تھے، اب کیمپ سے باہر جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مرہٹے دن بھر اپنے پڑاؤ

سرداروں کو بطور پرمال ہمارے پاس چھوڑ دیں۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا: "ہمارا معاملہ چند سرداروں کے ساتھ نہیں، مرہٹوں کے ساتھ ہے جو پورے ہندوستان پر قابض ہونے کا عزم کر چکے ہیں، اگر چند سرداروں کی جان کا خطرہ اس کے علاوہ اس میں حائل ہو تو اسے نئے سردار تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ مجھے اپنے اکابر کی ذہنیت پر تعجب ہوتا ہے جو ایک ایسے دشمن کے ساتھ سودا بازی سے زندہ رہنا چاہتے ہیں جس کی پوری تاریخ ریاکاری، بے رحمی اور محرومیت کی داستانوں سے لبریز ہے جس میں آپ کو ان لوگوں کے ساتھ مصافحہ کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا جن کے ہاتھ میری قوم کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ہمارا سابقہ ایک ایسے دشمن کے ساتھ ہے جو حالات کے مطابق اپنا طریق کار بدلتا رہتا ہے۔ جو طاقت ور کے سامنے بیٹھا اور کمزور کے سامنے شیر بن جاتا ہے۔ میں مرہٹوں کے ساتھ صلح کی بات کرنے سے پہلے اپنے معزز دوست سے یہ گزارش کروں گا کہ وہ ہمارے ساتھ بحث کرنے سے پہلے اپنی فوج کے کسی معمولی سپاہی کے ساتھ مشورہ کر لیں۔ اگر وہ یہ کہے کہ مرہٹوں کے یہاں سے زندہ اور سلامت بچ نکلنے کے دو یا تین سال بعد لکھنؤ کی گلیاں ان کی لوٹ مار اور قتل و غارت سے محفوظ ہوں گی تو میں اپنا موقف بدلنے کے لیے آمادہ ہو جاؤں گا۔ مرہٹوں کی منزل مقصود پانی پت نہ تھی۔ ان کی نگاہیں قابل ہندوؤں اور غزنی پر تھیں۔ اب وہ شاید یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا یہاں آنا ایک احمقانہ فعل تھا اور ان کا یہ سمجھنا بھی ایک حماقت تھا کہ ہم آنکھیں بند کر کے ان کی توپوں کے سننے کھڑے ہو جائیں گے۔ اب ان کے لیے اپنی غلطی کی تلافی کی یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ وہ یہاں سے بچ کر چلے جائیں اور ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر اگلے سال یا اس سے اگلے سال زیادہ تیاریوں کے ساتھ واپس آئیں۔ اگر ہم نے انہیں صبح سلامت بچ نکلنے کی اجازت دی تو مستقبل کے مورخ ہمیں ان کی نسبت کہیں زیادہ احمق خیال کریں

کے چاروں طرف افغان شمسواروں کے تیز رفتار گھوڑوں کے تنوں سے اٹھنے والا گرد و غبار دیکھتے تھے اور موسم سرما کی طویل اور اداس راتیں گزارنے کے بعد جب وہ صبح کے وقت بیدار ہوتے تھے تو انہیں اپنے خیموں میں دشمن کی گولیوں کے نشان دکھائی دیتے تھے۔ بھوک سے مرنے والے انسانوں، گھوڑوں اور سیلوں کی لاشوں کا تعفن میلوں تک پھیل چکا تھا۔ فضا میں دن بھر چیلوں اور گدگدوں کے غول نظر آتے تھے۔



ایک دن احمد شاہ ابدلی کے خیمے میں فوج کے بڑے بڑے سردار جمع تھے۔ صلح کے لیے مرہٹوں کی پیشکش پر غور کیا جا رہا تھا۔ شجاع الدولہ جس کی وساطت سے مرہٹوں نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کی تھی، احمد شاہ ابدلی سے کہہ رہا تھا: "عالیجاہ! مرہٹے فائدہ کش سے تنگ آپکے ہیں اور وہ صلح کے لیے ہماری ہر شرط ماننے کو تیار ہیں۔ اگر ان کی پیشکش ٹھکرا دی گئی تو انہیں مجبوراً میدان میں آنا پڑے گا اور اس گئی گذری حالت میں بھی ان کی فوجی قوت ایسی نہیں کہ انہیں آسانی سے شکست دی جاسکے۔ وہ دلی خالی کر کے واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔ ان سے یہ وعدہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ وہ دوبارہ شمال کا رخ نہیں کریں گے اگر ہم لڑے بغیر اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نجیب الدولہ ہزاروں جانیں ضائع کرنے پر کیوں مہم ہیں؟

نجیب الدولہ نے کہا: "عالیجاہ! ہمارا مقصد مرہٹوں کو پانی پت کے میدان سے بھگانا نہیں بلکہ اس طاقت کو ختم کرنا ہے جو اس ملک میں مسلمانوں کی عزت اور بقا کے لیے ایک خطرہ عظیم بن چکی ہے۔ مرہٹے اب لڑے بغیر اس لیے واپس جانا چاہتے ہیں کہ انہیں لڑائی میں اپنی تباہی نظر آتی ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ زیادہ تیاری کے بعد واپس نہیں آئیں گے؟

شجاع الدولہ نے کہا: "ان کے سامنے یہ شرط پیش کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے چند

گے۔ میں آئندہ کسی وقت ان کے ساتھ لڑنے کی بجائے آج ہی ان سے ٹپٹ لینا بہتر سمجھتا ہوں اور اگر میرے معزز دوست حقیقت پسندی کا ثبوت دیں تو انہیں بھی یہی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ مرہٹے "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول کے قائل نہیں۔ اگر وہ جنگ کے میدان سے بچ نکلنے کے لیے ہمارے ساتھ مصالحت کر لیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ واپس جاتے ہوئے ہمارا اثر تک راستے کی بستیوں اور شہروں کو رکھ کے انبار بنا کر نہیں رکھ دیں گے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جس تلوار کو وہ ہمارے سپاہیوں کے سامنے بے نیام کرنے سے ہچکچاتے ہیں وہ ان کے راستے کے نہتے اور بے لیں انسانوں کے قتل عام سے دریغ کرے گی؟

عالیجاہ! میرے حلق میں چیخوں کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی ذلت و رسوائی کے دلخراش مناظر دیکھے ہیں۔ میں نے روہیکھنڈ کی بستیوں اور ولی کے بازاروں میں ان درندوں کو انسانیت کا منہ نوچتے دیکھا ہے۔ میں ان کے قول و قرار پر اعتماد نہیں کر سکتا اور نواب شجاع الدولہ کو بھی میں یہ مشورہ دوں گا کہ انہیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے روہیکھنڈ کی طرح اودھ کی سرحدوں پر بھی کوئی ایسی دیوار دکھائی نہیں دیتی جو مرہٹوں کی جارحیت کو روک سکتی ہو۔ مجھے تو ان سے یہ بات بھی بعید معلوم نہیں ہوتی کہ وہ نواب شجاع الدولہ کی کوششوں کے طفیل یہاں سے بچ کر نکلیں گے اور واپس جاتے ہوئے مکنتوں میں اپنی وحشت اور بربریت کی ناقابل فراموش یادگار چھوڑ جائیں گے۔

نواب شجاع الدولہ نے کہا۔ "نجیب الدولہ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے، اگر آپ حضرات کی رائے یہی ہے کہ مرہٹوں کے ساتھ بہر حال جنگ کی جائے تو میں تیار رہنا چاہیے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میری فوج کسی سے پیچھے نہیں رہے گی۔"

۱۳ جنوری ۱۷۶۱ء کا آفتاب ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین معرکہ دیکھ رہا تھا۔ طلوعِ سحر کے ساتھ مرہٹہ فوج نے میلوں لمبی صفوں میں اپنے پٹاؤ سے نکل کر لگے بڑھنا شروع کیا۔ ان کے میسرہ پر گاردی کے تربیت یافتہ دستے تھے اور اس کے ساتھ گلیوار کی فوجیں تھیں۔ میمنہ میں ملہار راؤ ٹکرا اور جنگوجی سندھیا تھے۔ قلب لشکر میں بھاؤ اور بشواس راؤ ایک جنگی ہاتھی کے بوج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے لشکر کے قلب میں ابدالی کا وزیر اعظم شاہ ولی خان تھا اور اس کی کمان میں درانی فوج کے وہ آزمودہ کار جانا بہت تھے جو کئی میلاؤں میں داؤ شجاعت دے چکے تھے۔ میسرہ پر شاہ پسند خاں اور نجیب الدولہ تھے۔ شجاع الدولہ کی افواج میسرہ اور قلب لشکر کے درمیان تھیں۔ میمنہ کی قیادت برغور دار خاں کے ہاتھ میں تھی اور روسید، مغل اور بلراج سپاہیوں کے کئی دستے اس کے ساتھ تھے۔

احمد شاہ ابدالی ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی عتباتی لگا ہوں سے میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ برق رفتار سواروں کی ایک جماعت فوج کے جرنیوں اور سالاروں کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی ہدایت سپنانے میں مصروف تھی۔ جنگ کی ابتدا مرہٹوں کی آتشبازی سے ہوئی اور اس کے بعد گاردی کے تربیت یافتہ دستوں نے افغان فوج کے دائیں بازو کے روسید دستوں پر سنگین حملہ کر دیا۔ روسیوں کے پیچھے ہٹتے ہی بھاؤ نے اپنے سواروں کو ایک عام حملے کا حکم دیا اور افغان فوج کی اگلی تین صفیں درہم برہم کر دیں۔ پانی پت کا معرکہ اب پوری شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ گردوغبار کے بادلوں میں گھوڑوں کی ٹاپ، توپوں کی دھندل، بند توپوں کے دھماکوں، تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخ پکار کے ساتھ ایک طرف سے "اللہ اکبر" اور دوسری طرف سے "ہر ہر مادیو" کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ شاہ ولی خاں نے

اپنے جرنیوں کو فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اب گردوغبار کی یہ حالت تھی کہ زمین اور آسمان میں تیز کرنا مشکل تھا۔ ابدالی کے محفوظ دستے اس کے شکر کے عتب سے ایک اندھی کی طرح نمودار ہوئے اور دشمن کے میز اور میسرہ کی صفیں چرتے ہوئے اس کے عتب میں جا پیچے۔ تازہ دم فوج کے میدان میں آجانے سے محفوظ فوج کے دستے دشمن کی صفیں روندتے ہوئے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ سواروں کے قریب لشکر راؤ گولی گئے سے زخمی ہو گیا۔ بھانے دل برداشتہ ہو کر آخری بار پوری شدت کے ساتھ حملہ کیا اور بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ سب سالار کی موت سے مرہٹوں کے حوصلے لپٹ ہو گئے اور شام کے چار بجے کے قریب ایک ایک ان کی ساری فوج میدان سے بھاگ نکلی۔ خارج فوج نے ان کا پیچھا کیا اور مرہٹہ کیپ کی خندق لاشوں سے بھری۔ آفتاب کی واپسین نگاہیں کوسوں دور تک مرہٹوں کی تباہی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ابدالی کا لشکر چاندنی رات میں طلوع سحر تک مرہٹوں کا تعاقب کرتا رہا۔ اگلی صبح کیپ میں پناہ لینے والے بچے کچھ دستوں پر بھی لیٹا رہی گئی۔ لشکر راؤ زخمی ہونے کے چند گھنٹے بعد مرچکا تھا۔ میدان سے بھاگنے والی مرہٹہ فوج کا تعاقب کرنے والے صرف افغان رہے۔ بوج اور مغل ہی نہ تھے بلکہ قرب و جوار کے وہ دیہاتی جن پر مرہٹوں نے پانی پت ہیں قیام کے دوران میں ان گنت مظالم کیے تھے۔ تواروں۔ برجیوں اور لاشیوں سے مسلح ہو کر جگہ جگہ انھیں موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ مرہٹوں سے عوام کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ دیہات کی عورتیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ مرہٹہ کیپ کا مال غنیمت کسی بڑی سلطنت کے خزانوں سے کم نہ تھا۔ جواہرات، سونے اور چاندی کے علاوہ ہزاروں بیل گاڑیاں، کوئی دولاکھ مویشی، ہزاروں گھوڑے اور اونٹ اور پانچ سو ساتھی افغانوں کے ہاتھ گئے۔

مرہٹہ فوج کے بیشتر سوار جنگ میں کام آچکے تھے۔ اگلے دن مرہٹوں کے

افغانوں کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر پوری قوت سے چلایا۔ میرے رفیق! تم کہاں جا رہے ہو؟ ہمارا وطن بہت دور ہے۔ لیکن اس کی آواز جنگ کے مہیب ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گئی۔ جنگ کے ابتدائی دور میں مرہٹوں کا پانسہ بھاری معلوم ہوتا تھا۔ افغانوں کے میمنہ اور قلب لشکر میں اخراجی پھیل چکی تھی لیکن میسرہ کی افواج ابھی تک پوری طرح منظم تھیں۔ نجیب الدولہ جوابی حملہ کر چکا تھا اور اس کے ساتھ حافظ رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سرداروں کی افواج پوری شدت کے ساتھ مرہٹوں پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔ نجیب الدولہ کے پیادہ سپاہی دشمن کی صفوں پر ہوا پٹیاں اور گولے پھینکتے اور جب دشمن پیچھے ہٹتا تو تیز باز لوٹ پڑتے۔ معظم علی کی کمان میں ایک ہزار روہیلہ سوار تھے اور ان میں سے اکثر اکبر خاں کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے مرہٹہ لشکر کے میمنہ پر حملہ کیا اور چند منٹ کے اندر اندر جنگجو سپاہیوں کی فوج کی کئی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ اس کے بعد دوسرے روہیلہ سردار اور نجیب الدولہ کے چند دستے اس کے ساتھ جا ملے اور انھوں نے مل کر پلے در پلے حملے کر کے دشمن کو پیچھے ہٹانا شروع کر دیا۔ سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا لیکن لڑنے والوں کو گردوغبار کے بادلوں میں اس کے صرف دھندلے سے آثار نظر آتے تھے۔ جنگ اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی کہ جب ہر دقت فریقین میں سے کسی ایک کے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے کا امکان تھا۔ اس ہنگامہ محشر میں جس شخص کے چہرے پر اضطراب، گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے وہ احمد شاہ ابدالی تھا۔ اس کی پیشانی پر اپنے سپاہیوں کے لیے فتح کی بشارت لکھی ہوئی تھی۔ مرہٹے اپنی ساری قوت میدان میں لاپکے تھے لیکن احمد شاہ ابدالی کے ترکش میں ایک آخری تیرا بھی باقی تھا۔ دوپہر کے وقت اس نے اپنی محفوظ فوج کے ان چودہ ہزار سواروں کو میدان میں آنے کا حکم دیا۔ جنھیں جنگ شروع ہونے سے قبل میدان سے پیچھے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہر محاذ سے

معظم علی شام تک نہ آیا تو ہم چند دستے اس کی تلاش میں بھیج دیں گے۔
تھکاوٹ کے باعث اکبر خاں کے اعضاء ریش ہو چکے تھے۔ وہ کچھ اور کچھ بغیر
زمین پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد شتر سوار کیمپ میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا
اور اس نے بلند آواز میں کہا: "اکبر اکبر! معظم علی آگئے!"
کہاں میں وہ؟ اکبر خاں نے جلدی سے اٹھ کر سوال کیا۔

نوجوان نے اس کے جواب میں شتر سواروں کی طرف اشارہ کر دیا۔ اکبر خاں بھاگ
کر آگے بڑھا۔ معظم علی ایک اونٹ پر سوار تھا۔ اس کا چہرہ گردوغبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس کی
تباغون سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کی گردن بھی ہوئی تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ اس نے
ڈھیٹے ہاتھ سے اونٹ کی ٹکلیں پکڑ رکھی تھیں۔

"بھائی جان بھائی!" اکبر خاں نے اس کے ہاتھ سے اونٹ کی ٹکلی پکڑتے ہوئے
پوچھا: "آپ ٹھیک ہیں نا، آپ زخمی تو نہیں؟"
معظم علی نے نیم بیہوشی کی حالت میں آنکھیں اوپر اٹھائیں اور تھکی ہوئی آواز میں
کہا: "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اکبر خاں نے ٹکلی کھینچ کر اس کا اونٹ بٹھا دیا اور معظم علی نیچے اتر پڑا۔ اکبر خاں کو
اس کی آستین پر تازہ خون کے نشان دکھائی دیئے۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا: بھائی
جان آپ زخمی ہیں۔"

معظم علی مسکرایا: "یہ معمولی خراش ہے۔"

"معظم علی! معظم علی! تم کہاں تھے؟" نجیب الدولہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
"میں بہت دور نکل گیا تھا۔" معظم علی نے یہ کہہ کر لوٹھراتے ہوئے نجیب الدولہ کی
طرف چند قدم اٹھائے لیکن اچانک اس کی طاقت جواب دے گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔

تغائب سے واپس آنے والے جرنیل اور بڑے بڑے افسر احمد شاہ ابدالی کے سامنے
باری باری اپنی کارگزاری کی تفصیلات بیان کر رہے تھے۔ دوپہر تک قریباً تمام فرج
کیمپ میں جمع ہو چکی تھی لیکن معظم علی اور اس کی کمان کے چند دستے لاپتہ تھے۔ اکبر
خاں اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے اسے رات کے پچھلے پہر ہلکے کے ساتھ فرار
ہونے والے سپاہیوں کا تعاقب کرتے دیکھا تھا۔ غزوب آفتاب سے کچھ دیر پہلے
جب اکبر خاں اس کی تلاش میں کیمپ کے اندر کئی چکر لگا چکا تھا اور نجیب الدولہ، حافظ
رحمت خاں اور دوسرے روہیلہ سردار اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے، ایک وسیلہ
سپاہی نے جنوب مشرق کے افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا: "شاید
وہ آ رہے ہیں!"

اکبر خاں نے چونک کر دیکھا اور اسے دور حد نگاہ پر چند شتر سوار دکھائی دیئے، اس
نے مضطرب ہو کر کہا: "لیکن وہ گھوڑوں پر تھے، یہ کوئی اور ہیں۔"

نجیب الدولہ نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "بیٹا
تھیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ معظم علی ضرور آئے گا۔" اور اکبر خاں اپنے دل میں کہہ رہا
تھا: "اخیر۔۔۔ اور گانا چاہیئے۔ ہماری یہ شاندار فتح ان کے لیے تھی۔ ہماری اس کامیابی
پر ان سے زیادہ خوش ہونے کا حق نہیں۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر
بولے: "تم تیرے ہم ان کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ کسی جگہ دشمن کے
گھیرے میں اپنے ہیں۔"

نجیب الدولہ نے کہا: "دشمن میں اب لڑنے کی ہمت نہیں اور اس وقت کسی
گھوڑے میں سوار کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رہی۔"

ہم پیدل بھائی گئے؟ اکبر خاں نے کہا۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا: "اپنے ساتھیوں کو تھوڑی دیر آرام کرنے دو۔ اگر

اکبر، نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں نے بیک وقت آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک سپاہی نے پانی کی چھالگ امار اس کے منہ سے لگا دی۔ معظم علی نے پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا:

”آپ دوگوں کو مطلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔“

حافظ رحمت خاں نے اس کی آستین پھاڑ کر بازو کا زخم دیکھتے ہوئے کہا: ”بحر معمولی ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

ایک سپاہی نے اپنا پٹکا پھاڑ کر بازو باندھ دیا اور وہ دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔

نجیب الدولہ نے کہا: ”اسے اٹھا کر میرے خیمے میں لے جاؤ۔“

”نہیں“ معظم علی نے نجیب آواز میں جواب دیا۔ ”مجھے تھوڑی دیر نہیں رہنے دیجیے۔“

چند ثانیے بعد معظم علی گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے سامنے بھی اب ادبوں سے اتر کر اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ایک نوجوان نجیب الدولہ کو بتا رہا تھا: ”ہم نے پلک میں تک دشمن کا پیچھا کیا تھا۔ ہمارے گھوڑے دم توڑ چکے تھے تو ہم پیدل ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ یہ اونٹ ہم نے مرہٹوں سے چھینے تھے اور ہمارے پچاس اور ساتھی پیدل واپس آ رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد بعد احمد شاہ ابدالی اپنے چند جرنیلوں کے ساتھ پڑاؤ میں گشت کرتا ہوا ادھر آ نکلا۔ ”یہ کون ہے؟“ اس نے معظم علی کے قریب پہنچ کر سوال کیا۔

نجیب الدولہ نے جواب دیا: ”عالیجاہ! یہ معظم علی خاں ہے اور یہ ابھی مرہٹوں کے قاتل سے واپس آیا ہے۔“

”اس کے زخم زیادہ خطرناک تو نہیں؟“

”نہیں عالیجاہ! یہ بہت تھک گیا ہے۔“

شاہ دلی خاں نے کہا: ”میں اسے میدان میں کئی بار دیکھ چکا ہوں اور اگر یہ اب تک دشمن کا پیچھا کر رہا تھا تو اس کا زخم رہنا معجزہ ہے۔“

ابدالی نے کہا: ”یہاں سردی ہے اسے خیمے کے اندر لے جاؤ۔“

اکبر خاں نے معظم علی کا بازو پکڑ کر لایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے ابدالی کو دیکھ کر اٹھا اور باادب کھڑا ہو گیا۔

ابدالی نے اس کے غن آلود کپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور تمہیں اس سے بہتر لباس کی ضرورت ہے۔“ پھر اس نے اپنے ایک انسر کی طرف دیکھا اور کہا: ”جاؤ اسے میرا لباس لا دو!“

چند دن بعد احمد شاہ ابدالی کی افواج دلی کا رخ کر رہی تھیں۔ پانی پت کی شکست مرہٹہ تاریخ کی ایک محفل شکست تھی۔ ٹکڑا، داماجی گھوڑا نالو شکر، ہبادیو جی سندھیا اور نانا فرولیس کے سوا تمام بڑے بڑے مرہٹہ سردار مارے جا چکے تھے۔ ابراہیم گاردی جسے مسلمانوں کا بدترین غدار سمجھا جاتا تھا، گرفتار ہونے کے بعد قتل کیا گیا۔ شمشیر بہادر اور آنتاجی منگیشو، جو دشمنی ہو کر بھاگے تھے، راستے میں مر گئے۔ مرہٹوں کی عظیم فوج میں سے صرف ایک چوتھائی سپاہی ایسے تھے جنہیں دوبارہ اپنا وطن دیکھنا نصیب ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کو بھی اس فتح کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی لیکن وہ عظیم مقصد جس کے لیے یہ جنگ لڑی گئی تھی، پورا ہو چکا تھا۔ شمالی ہندوستان میں پاؤں پھیلا، کے متعلق مرہٹوں کے عزائم ہمیشہ کے لیے خاک میں مل چکے تھے۔

چودھواں باب

چند دن بعد افغان افواج دلی کے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں اور شہر میں پانی پت کی فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں عید کا سا سماں تھا۔ اہل شہر کے علاوہ فرج کے افسر اور سپاہی مسجد کے اندر اور مسجد کی چار دیواری سے باہر کھلے میدان میں جمع تھے۔ نماز کے بعد احمد شاہ ابدالی کی عزت، اقبال اور درازی عمر کے لیے دعا کی جا رہی تھی۔ دعا کے اختتام پر جب نمازی اٹھنے لگے تو خطیب نے بلند آواز میں کہا۔

حضرات تھوڑی دیر ٹھہر جائیے، پانی پت کا ایک مجاہد آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ نمازی ہمرق گوش ہو کر منبر کی طرف دیکھنے لگے۔ معظم علی اٹھ کر منبر کے قریب پہنچا اور اس نے بلند آواز میں کہا،

”عزیزو اور بزرگو! پانی پت کی فتح بلاشبہ ہماری تاریخ کا شاندار کارنامہ ہے۔ ہمارے بعد آنے والی نسلیں یقیناً احمد شاہ ابدالی کو اپنا عظیم خیال کریں گی۔ انھوں نے ہمیں اس وقت سہارا دیا ہے جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ہمیں اس دشمن سے نجات دلائی ہے جو ہمیں بدترین غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتا تھا۔ ہم ان کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے لیکن اس وقت ہماری دعاؤں کے سب سے زیادہ مستحق پانی پت کے وہ شہداء ہیں جنہوں نے ہماری عزت، ہماری آزادی اور ہماری بقا کے لیے اپنا خون پیش کیا ہے۔ آج ان گناہم شہیدوں کی رو میں ہم سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں کہ ہم

پانی پت کے میدان میں جا کر ان کی قبروں پر چراغ جلا دیں۔ ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ہم کسی وقت بھی اس مقصد سے انحراف نہ کریں جس کے لیے وہ اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ پانی پت کے شہیدوں نے ہمیں اس ملک میں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے اور اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ قدرت کسی گرتی ہوئی قوم کو بار بار سنبھالا نہیں دیتی۔

ہمارے عظیم محسن احمد شاہ ابدالی نے ہمیں اس وقت ایک نئی زندگی کا پیغام دیا ہے جب کہ ہمارے دروازے پر موت کا پرہ تھا۔ انھوں نے ایک منتشر، مفلک الحال اور بایوس قافلے کو اٹھا کر پھر زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔ اب یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ ہماری اگلی منزل کیا ہے۔ ہماری ماضی کی وہ کون سی کوتاہیاں تھیں جن کے باعث مرہٹوں کی بربریت اور جنت کا طوفان انہیں تنگ پہنچ چکا تھا اور ہم سے ہمارے حال اور ہمارے مستقبل کے مطاببات کیا ہیں؟ احمد شاہ ابدالی اپنے حصے کا کام پورا کر چکے ہیں لیکن ہمارے حصے کا کام ابھی باقی ہے۔ پانی پت کی جنگ میں مرہٹوں کی کرٹ جکی ہے لیکن ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اگر ہم نے اپنی کمزوریوں کا علاج نہ کیا تو ممکن ہے کہ چند برس کے اندر اندر ہمیں مرہٹوں سے زیادہ خطرناک دشمنوں کا سامنا کرنا پڑے۔ جنگل میں ہماری آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔ کرناٹک فرنگیوں کی شکار گاہ بن چکا ہے اور ان کی سازشیں دکن تک پہنچ چکی ہیں۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت ابھر رہی ہے اور اگر ہم نے انہیں نہ سکھوں کی توجہ سے لے لیا تو ہمیں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بے بسی اور مظلومیت کا باعث وہ مفاد پرست

جائے جس پر ہم نے صدیوں حکومت کی ہے۔

حضرات! احمد شاہ ابدالی نے ہمیں ایک خطرہ عظیم سے نجات دلائی ہے لیکن وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے جس کے مکینوں نے چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنا حافظہ سمجھ رکھا ہو۔ ہماری بے بسی اور مظلومیت کا باعث وہ مفاد پرست

اعادہ نہ کریں جن کے باعث بنگال میں ہم ایک عبرت تک تباہی کا سامنا کر چکے ہیں اور
میں عوام سے بھی یہ درخواست کروں گا کہ وہ اپنے گرد پیش سے خبردار رہیں اور جب انہیں
کوئی بیرونی حملہ آور لگا رہا ہو تو وہ میدان میں آنے سے پہلے یہ تسلی کر لیں کہ ان کی صفوں
میں کوئی میر جعفر تو نہیں ہے!

حضرات! مجھے تقریر کرنے کا شوق نہ تھا۔ میں صرف ایک سپاہی ہوں۔ میں نے
بنگال کی آزادی کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔ میرا باپ، میرا بھائی اور میرے
بہترین دوست بنگال پر قربان ہو چکے ہیں لیکن یہ بے لوث قربانیاں صرف اس لیے
بے نتیجہ ثابت ہوئیں کہ بنگال کے عوام اس قدر بیدار نہ تھے کہ وہ مہمان قوم اور وطن دوستوں
کے درمیان تفریق کر سکتے۔ میں نے شہرت اور ناموری کے لیے پانی پت کی جنگ میں حصہ
نہیں لیا تھا بلکہ میرے دل میں اگر کوئی تڑپ تھی تو یہ تھی کہ ان بھینٹک تارکیوں کو آپ کے
گھروں سے دور رکھا جائے جو بنگال کے مسلمانوں پر مسلط ہو چکی ہیں اور آج میں نے آپ
کے سامنے زبان کھولنے کی صرف اس لیے جرأت کی ہے کہ میں آپ کو ان خطرات سے
خبردار کرنا چاہتا ہوں جو حال اور مستقبل سے آنکھیں بند کر لینے کی صورت میں آپ کو پیش
آ سکتے ہیں۔

انتقام پر میں یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو پانی پت کی فتح سے اپنے لیے اور اپنی
آئندہ نسلیں کے لیے صمیم نتائج پیدا کرنے کی جرأت، ہمت اور طاقت دے۔ خدا بھارہ
امرا اور حکمرانوں کو بھی یہ توفیق دے کہ وہ قوم کے لیے زندہ رہنا سیکھیں۔
معظم علی کی تقریر کے انتقام پر جب لوگ مسجد سے باہر نکل رہے تھے تو ایک
افغان افسر نے اس سے کہا: حضور بادشاہ سلامت آپ کو بلاتے ہیں!

احمد شاہ اہل ہالی منبر سے تھوڑی دور دلی کے اکابر اور اپنے سرداروں کے درمیان
کھڑے تھے۔ معظم علی ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے کہا: میں ایک مدت سے اس

امراء میں جنہوں نے قوم کے مستقبل سے بے پروا ہو کر دلی کی عظیم سلطنت کو چھوٹے
چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ہماری مایوسی اور بددلی کا باعث وہ عملاتی سیاست
ہے جو ہر ضابطہ اخلاق سے آزاد ہو چکی ہے۔ بنگال میں مٹھی بھر انگریزوں سے ہماری
شکست کا باعث وہ وطن فروش تھے جنہوں نے قوم کا ساتھ چھوڑ کر اپنا مستقبل انگریزوں
کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا اور اگر آپ نے بنگال کے واقعات سے سبق نہ لیا اور اسی
طرح انتشار اور لامرکزیت کی لغتوں میں مبتلا رہے تو بنگال کی تاریخ اس ملک کے
ہر حصے میں دہرائی جائے گی۔ کسی قوم کے لیے اس سے بڑا عذاب اور کیا ہو سکتا ہے کہ ملت
فروش اس کی عزت اور آزادی کے امین بن جائیں اور حریف طالع آنا اقتدار کی مسندوں
پر چھکیں ہو جائیں۔ گزشتہ نصف صدی کے واقعات سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح
ہو چکی ہے کہ یہ دنیا کسی کمزور قوم کو عزت اور آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا حق نہیں دیتی
جو ملک انتشار اور لامرکزیت کا شکار ہوتا ہے وہ لامحالہ انسانی بیڑیوں کی شکار گاہ بن
جاتا ہے۔

آج اس مسجد میں وہ لوگ موجود ہیں جن کی حقیقت پسندی ہمیں مستقبل کے خطرات
سے بچا سکتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے باشندوں کو ان جاہ پسندوں کے
خلاف عوام کی قوت مجاہدہ بیدار کریں جن کی چہرہ دستیوں کے باعث ہماری قوت مدافعت
اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ ہم اپنے حقیر ترین دشمنوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پانی پت کی
جنگ اس لیے نہیں لڑی گئی ہے کہ ہمارے حکمران مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی
مسندوں پر سو جائیں یا انہیں کچھ عرصہ اور عیش و عشرت کی محفلیں آرامتہ کرنے کا موقع مل
جائے۔ پانی پت کی جنگ اس لیے لڑی گئی ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو عزت اور
آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ میں اس ملک کی حکومت کے
دورداروں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ ماضی سے سبق سیکھیں اور ان غلطیوں کا

کر کے تھارا کھٹو ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔

معظم علی نے جواب دیا: "کھٹو میرے سفر کی آخری منزل نہیں اور جب مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ دہاں رہ کر میری زبان میرے ضمیر کا ساتھ نہیں دے سکتی تو میں اپنے لیے کوئی اور جگہ تلاش کرنے میں تکلیف محسوس نہیں کروں گا۔"

نجیب الدولہ نے چند ثانیے سوچنے کے بعد کہا: "میں نے شجاع الدولہ کو سمجھا دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ تم کو پریشان نہیں کرے گا لیکن اگر کسی وقت تم کو کھٹو کی آہٹ ہو جائے تو تم اسے دے دینا کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ اگر اس وقت بھی تم پسند کرو تو میں تم کو فوج میں بہترین عہدہ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

معظم علی نے جواب دیا: "ابھی دلی کے حالات اس قابل نہیں کہ میرے دل میں ملازمت کا شوق پیدا ہوا۔ جس دن مجھے اس بات کا احساس ہوگا کہ میں یہاں آکر کوئی مفید کام کر سکتا ہوں تو آپ مجھے ایک رضا کار کی حیثیت میں یہاں موجود بنائیں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد دلی کے حالات کیا ہوں گے۔ آپ کے تدبیر اور فراست پر اعتماد ہے لیکن جب تک دلی کے تخت پر کوئی اور العزم حکمران نہیں بیٹھتا میرے نزدیک دلی اور کھٹو میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ہماری بستی ہے کہ اسی عظیم الشان فتح کے بعد اس ملک کے اکابر قوم کا مستقبل کسی ایسے حکمران کو نہیں سونپ سکے جس کی سیرت اور کردار رعایا کی آزادی اور بقا کی ضمانت دے سکتا ہو۔ میں یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ قابلیت کے بغیر کوئی شخص اپنے سر پر تاج پہننے کا پیرائے حق رکھتا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں ہم اپنے نام نہاد حکمرانوں کی نااہلیت کے باعث بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ قدرت نے ہمیں زندہ رہنے کا ایک اور موقع دیا ہے لیکن کاش ہمارا وہ دماغ جس نے ہمیں مرہٹوں کی جارحیت سے نجات دلانی ہے ہمیں یہ مرہوہ بھی دنا سکتا کہ دلی کے تخت کے لیے ایک انسان کی ضرورت ہے اور اس ملک

ملک کے کسی آدمی کے منہ سے ایسی باتیں سننے کا منظر تھا۔ اگر ہندوستان کے ہر علاقے میں تھارے جیسے صیخ الحیال لوگ جاگ اٹھیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ قوم تباہی سے بچ سکتی ہے۔" پھر انہوں نے ایک ثانیہ کے لیے شجاع الدولہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ معظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "لیکن اگر تم کسی مرحلہ پر یہ محسوس کرو کہ اس ملک میں تمہاری خدمات کی ضرورت نہیں تو سیدھے میرے پاس پہنچ جاؤ۔ دہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو حق گوئی کی قدر کرنا جانتے ہیں۔"

اگلے دن معظم علی ظہر کی نماز ادا کر کے جامع مسجد سے نکل رہا تھا کہ اسے نجیب الدولہ کی فوج کا ایک سپاہی دکھائی دیا۔
"آپ کو امیر الامراء نے یاد فرمایا ہے! سپاہی نے اگلے پڑھ کر ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ اس وقت فوج کے پڑاؤ میں ہیں۔ چلیے!"

تھوڑی دیر بعد معظم علی پڑاؤ کے ایک عالی شان خیمے کے اندر نجیب الدولہ کے سامنے کھڑا تھا۔ نجیب الدولہ نے کسی تمہید کے بغیر کہا: "کل مسجد میں تھارے منہ سے میرے دل کی آواز نکل رہی تھی لیکن شجاع الدولہ تمہاری تقریر سے بہت پریشان ہیں۔ وہ صبح مجھ سے ملے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سب ان کے متعلق تھا۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ یہ نوجوان کھٹو پہنچ کر میرے لیے سروردی کا باعث بنے گا۔ وہ اس سے پہلے بھی تم پر زیادہ خوش نہ تھے لیکن کل تمہاری تقریر نے انہیں بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے۔" معظم علی نے جواب دیا: "میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔" "میں تمہاری حق گوئی کا معترف ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شجاع الدولہ کو ناراض

میدانوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اب میں دو تین دن تک یہاں سے روانہ ہواؤں گا۔
نجیب الدولہ نے کہا: "یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔ اگر افغان ہوا
خالفت ذکر تے تو شاید اس وقت تک ہمارے گھوڑے دریائے نرپا کا پانی پی رہے
ہوتے لیکن میں تمہیں پھر ایک بار یہ مشورہ دوں گا کہ تم کھنڈ جا کر محتاط رہو۔ شجاع الدولہ ایک
منظم المزاج آدمی ہے۔ اگر اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ تم اسے پسند نہیں کرتے
تو وہ تم سے نجات حاصل کرنے کے ہزاروں بہانے تلاش کرے گا میں یہ چاہتا
ہوں کہ تم اسے اپنا دشمن بنانے کی بجائے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرو۔ جو سکتا
ہے کہ تمہارے خیالات سے متاثر ہو کہ وہ قوم کی بھلائی کا کوئی کام کر سکے۔
مظلم علی مسکرایا: "قوم کی بھلائی کے لیے میں ایک حقیر ترین انسان کے پاؤں پر
سر رکھنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

"اور تمہیں شاہ عالم کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار میں بھی محتاط رہنا چاہیے۔
نواب شجاع الدولہ اور ان کے ہم خیال اہل ان کے بہت زیادہ طرف دار ہیں۔
مظلم علی نے جواب دیا: "میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ انہیں ایک کارآمد کھلونا سمجھتے ہیں۔
مظلم علی نجیب الدولہ سے ملاقات کے بعد پڑاؤ میں اپنے خیمے کے قریب پہنچا تو
اکبر خاں بابر دھوپ میں بیٹھا ایک نوجوان سے باتیں کر رہا تھا۔ مظلم علی کو دیکھتے ہی اکبر خاں
نے اٹھ کر کہا: "بھائی جان یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

مظلم علی انہی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد چٹان پر بیٹھا۔
انہی نے کہا: "میرا نام اسد خاں ہے۔ میں میسور سے حیدر علی کا ایک خاص پیغام
لے کر احمد شاہ ابدالی کے پاس آیا تھا۔ کل مسجد میں میں نے آپ کی تقریر سنی تو میرے دل
میں آپ سے متعارف ہونے کا شوق پیدا ہوا۔
آپ احمد شاہ ابدالی سے مل چکے ہیں؟"

کے امراء کا یہ فرض ہے کہ اپنے میں سے بہترین آدمی کو قوم کی سیادت سونپ دیں۔
خدا کرے دلی کی حکومت کے نئے دعویدار سے آپ کی توقعات درست ثابت ہوں لیکن
مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ وہ صحیح معنوں میں حکمران ثابت ہوگا یا صرف یہاں کے
بادشاہ نگرہوں کے ہاتھ میں ایک نیا کھلونا ہوگا۔
"تم جانتے ہو کہ میں اس معاملے میں تمہارا ہم خیال تھا لیکن مغل امراء کا یہ مطالبہ
تھا کہ دلی کے تخت پر کسی جائز وارث کو بٹھایا جائے۔"

مظلم علی نے جواب دیا: "میرے نزدیک صرف وہ بات جائز ہوتی ہے جو صحیح بھی ہو۔
شاہ عالم کے متعلق میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ وہ دلی کی سازشوں سے خوفزدہ ہو کر
کس جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور جن امراء نے اسے تخت پر بٹھانے کے لیے بہت
زیادہ زور دیا ہے، وہ صرف اس بات پر خوش ہیں کہ وہ اپنے مقتول باپ سے زیادہ کمزور
ثابت ہوگا۔ میرے لیے اگر کوئی بات اطمینان بخش ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ دلی میں
احمد شاہ ابدالی کے مانند رہیں گے اور میں یہ دعا کرتا ہوں کہ نیا شہنشاہ کسی دن آپ
سے منہ پھیر کر ان لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بن جائے جو اس سے پیشتر کئی کھلونے توڑ
چکے ہیں۔"

"تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ شاہ عالم ایک ناکام حکمران ثابت ہوگا؟"
"میں اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ وہ ایک کمزور آدمی ہے اور اس
کی بادشاہت ہمیشہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوگی مجھے جلا وطنی کی حالت میں اس کی بے بسی
کا احساس ہے لیکن مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ تخت پر بیٹھ کر شاید وہ زیادہ بے بس ثابت ہوگا۔
نجیب الدولہ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا: "تم کب واپس جا رہے ہو؟"
مظلم علی نے جواب دیا: "میں صرف اس امید پر پھر گیا تھا کہ شاید احمد شاہ ابدالی واپس
جانے کا خیال ترک کر دیں اور جنوب کی طرف پیش قدمی کریں۔ میں انہیں مارا شٹر کے

سے آپ کے دل کا حال معلوم کر لیں گی۔

معظم علی نے جواب دیا: "میں حیدر علی کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں لیکن سر دست میں سرنگا پٹم جلنے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک مجھے حیدر آباد جانا پڑے اور اگر موقع ملا تو شاید میسور بھی دیکھ سکوں۔ بہر حال مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی ہے۔"



ایک دوپہر فرحت اپنے دو ماہ کے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور عابدہ اس کے قریب مصیے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ صابر ہانپتا ہوا آیا اور اس نے کمرے کے اندر جھانکتے ہوئے کہا: "بی بی جی - بی بی جی! خاں صاحب آگئے ہیں۔"

فرحت کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور عابدہ الحمد للہ کہہ کر سجدے میں گر پڑی۔ چند ثانیے بعد سیرتھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ فرحت نے بچے کو بستر پر لٹا دیا۔ معظم علی "السلام علیکم کہہ کر کمرے میں داخل ہوا اور فرحت اپنی نگاہوں میں ہزاروں دعائیں لیے لٹک کر کھڑی ہو گئی۔ پھر یہ دعائیں آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں پھسکنے لگیں اور اس نے کہا: "آپ کو فتح مبارک ہو!"

عابدہ سجدے سے سر اٹھا کر معظم علی کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ اسے سلام کر کے بچے کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عابدہ دعائیں دیتی ہوئی اٹھی اور اس نے بچے کو بستر سے اٹھا کر معظم علی کی گود میں رکھ دیا۔ تمہیں سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس نے کہا۔

معظم علی نے شرماتے ہوئے سوال کیا: "بی بی جان اس کا نام کیا رکھا ہے؟" "بیٹا ہم ہر روز اسے ایک نئے نام سے پکارا کرتے ہیں۔ شیر علی مہر تھے کہ اس کا نام صدیق علی رکھ دیا جائے لیکن فرحت کہتی تھی کہ تمہارے آنے تک انتظار کر لیا جائے۔" صدیق علی اچھا نام ہے بی بی جان! کیوں فرحت تمہارا کیا خیال ہے؟

جی ہاں! اور دو تین دن تک میں واپس جا رہا ہوں۔ کل آپ کی تقریر سننے کے بعد میں نے فوج کے ایک سپاہی سے آپ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کی تھیں میں نے یہ مزوری خیال کیا کہ آپ کو کسی دلی میسر کرنے کی دعوت دوں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق آپ جو خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ انشا اللہ میسور میں پورے ہوں گے۔ حیدر علی اس دور کی ایک بہت بڑی شخصیت ہے۔ وہ جنوبی ہندوستان کو ایک طرف مرہٹوں کی چیرہ دستیوں سے اور دوسری طرف انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے نجات دلانا چاہتا ہے اور اس نے میسور کے دروازے ہر صبح خیال مسلمان کے لیے کھول دیئے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب آپ اس کے متعلق یہ سنیں گے کہ جنوبی ہندوستان کے مسلمان اسے اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ میری اپنی سرگزشت یہ ہے کہ میں کرناٹک کی فوج میں ملازم تھا اور محمد علی دالاجاہ کی فوج کے انہروں کے اس گردے سے قلعہ رکھتا تھا جو الیٹ انڈیا کمپنی کو اس ملک کا بدترین دشمن سمجھا تھا۔ جب انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کے ساتھ جنگ شروع کی تھی تو محمد علی نے مدراس کے گورنر کی خواہش پر الیٹ انڈیا کمپنی کی مدد کے لیے چند دستے کھلتے بھیجے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے ان دستوں کی کمان کے لیے منتخب کیا گیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس پر مجھے بغاوت کے جرم میں پانچ سال قید کی سزا دی گئی لیکن چھ ماہ قید کاٹنے کے بعد مجھے فلورجئے کا موقع مل گیا اور میں سیدھا سرنگا پٹم پہنچ گیا۔ حیدر علی کی سفارش سے مجھے میسور کی فوج میں ملازمت مل گئی۔ اس وقت مجھے یہ توقع نہ تھی کہ میسور کے راجہ کی فوج کا یہ نڈر سپاہی کسی دن جنوبی ہند کی آزادی کا سب سے بڑا محافظ بنے گا۔ اگر آپ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں ہیں جو ہندوستان کے بے بس اور مایوس مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھائے تو آپ کسی دن سرنگا پٹم ضرور آئیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ آپ کو ان کے سامنے جا کر یہ بتانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی کہ آپ کون ہیں۔ ان کی مردم شناس نگاہیں آپ کے چہرے

فرحت ابھی تک مرت کے ساتویں آسمان پر پرواز کر رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔
”مجھے اس کے لیے ہر نام اچھا لگتا ہے۔“

عابدہ نے کہا: ”بیٹا میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں؟“

معظم علی نے جواب دیا: ”نہیں چچی جان کھانا میں راستے میں کھا چکا ہوں، آپ تشریف رکھیں۔ فرحت تم بھی بیٹھ جاؤ۔“

ماں اور بیٹی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

عابدہ نے کہا: ”بیٹا اکبر خاں ملا تھا؟“

چچی جان اکبر خاں میرے ساتھ تھا۔ جنگ میں اس کی بہادری کے قصے دور دور تک مشہور ہو چکے ہیں۔“

فرحت نے کہا: ”پچھلے بیٹے حیدر آباد سے شیخ فخر الدین کا خط آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپ اکبر خاں کو ساتھ لے کر حیدر آباد حورو آئیں۔“

معظم علی نے کہا: ”اب چند بیٹے میرا گھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ممکن ہے کہ اگلے سال میں دہاں جاؤں لیکن آپ اور چچی جان میرے ساتھ ہوں گی۔“

عابدہ نے کہا: ”بیٹا جب پانی پت میں تمہاری فتح کی خبر آئی تھی تو لکھنؤ میں چراغاں کیا گیا تھا۔ صابر کو اس بات پر اصرار تھا کہ سب سے زیادہ چراغ ہمارے مکان میں جلنے چاہئیں، جس کی رات ہمارے مکان کا کوئی گوشہ چراغوں سے خالی نہ رہتا۔ پھر شہر میں ایک رات چراغ جلانے گئے تھے لیکن صابر نے پوری رات راتیں چراغاں کیا۔ اب تم اطمینان سے ہمیں جنگ کے واقعات سناؤ۔“

معظم علی نے پانی پت کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو فرحت نے کہا: آپ کی باتیں سننے کے لیے صابر ہم سب سے زیادہ بیقرار رہے۔ آپ ذرا اونچی آواز میں باتیں کریں مجھے یقین ہے کہ وہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہے۔“

معظم علی مسکرایا: ”صابر اندر آ جاؤ۔“

صابر کمرے میں داخل ہوا اور نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ پھر معظم علی جنگ کے واقعات سنا رہا تھا اور صابر کے دل کی دھڑکنیں کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھیں۔ پانی پت کے آخری معرکے کی تفصیلات سننے کے بعد صابر اٹھ کر بے پاؤں کمرے سے باہر نکلا اور جگمگا ہوا صحن میں جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد گھر کے نوکر اور محلے کے لوگ اس کے گرد جمع ہوئے اور وہ انہیں اپنی لڑکھائیاں کے ساتھ معظم علی اور اکبر خاں کے بہادرانہ کارنامے سنا رہا تھا۔



پانی پت کی جنگ کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرح لکھنؤ کے مسلمان عوام میں بھی ایک نیا دھولہ بیدار ہو چکا تھا۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں عزیبوں کے جھونپڑوں سے لے کر امراء کے محلات تک ان بہادروں کی جافر دی کی داستانیں زبان زد عام تھیں جو مرثیوں کی عظیم ترین طاقت کو پامال کر چکے تھے۔ پانی پت کی فتح کے بعد لکھنؤ واپس آنے والے سپاہی اپنے ساتھ ہتھیار اور العزم مجاہدوں کے کارناموں کی روح پرور داستانیں لائے تھے اور معظم علی، جسے لکھنؤ کے لوگ کچھ مدت قبل صرف ایک کامیاب اور خوشحال تاجر کی حیثیت سے جانتے تھے، اب ان کی نگاہوں میں ایک قوی ہیرو بن چکا تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو عوام اس کے راستے میں آکھیں بچھاتے۔ اس کے ساتھ بمکھام ہونے یا مصافحہ کرنے میں ایک خوشی محسوس کرتے۔ ایر لوگ اسے دعوت دینے پر اصرار کرتے۔ طبقہ اعلیٰ کی خواتین اس کے گھر آکر فرحت کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتیں۔ معظم علی ان رسمی ملاقاتوں اور دعوتوں سے اجتناب کرتا لیکن کبھی لوگوں کی گرج و مجلس میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہر محفل میں اس سے پانی پت کی جنگ کی تفصیلات سننے کا مطالبہ کیا جاتا۔ بسا اوقات وہ اپنے عقیدت مندوں کو مختصر سا جواب دے کر ٹالنے

روہیلہ سپاہی اودھ کے سپاہیوں سے بہتر ہیں؟
معظم علی نے جواب دیا: اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ روہیلہ سپاہیوں کی تعریف کرنے سے
اودھ والوں کی توہین ہوتی ہے تو میں آپ سے گفتگو کرنا پسند نہیں کروں گا۔ افسر خاموش
ہو گیا اور معظم علی نے درے توہن کے بعد کہا: اگر آپ حضرات براہ مابین تو میں یہ کہوں
گا کہ روہیلہ کا ہر جوان اس جنگ کو اپنی بقا اور آزادی کی جنگ سمجھتا تھا لیکن دلاں بعض
لوگ ایسے بھی تھے جو اس جنگ کو صرف اپنے امراء کی جنگ سمجھتے تھے اور میں آپ سے یہ
درخواست کروں گا کہ آپ اس محفل میں مجھے ان امراء کا تذکرہ چھپانے پر مجبور نہ کریں جو آخری
وقت اس کوشش میں تھے کہ مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی جائے اور وہ ٹوٹے بغیر فتح کے
نعرے لگاتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔

ایک امیر زادے نے کہا: لیکن آپ اس بات سے انکار نہیں کیسے کہ پانی پت کی
فتح کے لیے ہمیں بہت بڑی قربانی دینی پڑی ہے اور احمد شاہ ابدالی کے ہزاروں سپاہیوں
کے نقصان کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ افغان سرداروں نے دلی سے آگے بڑھنے سے انکار کر
دیا ہے اگر خبیث الدولہ پانی پت کے میلان میں مرہٹوں کے ساتھ قوت آزمائی پر مقرر نہ
ہوتے تو مرہٹوں سے آئندہ پراسن رہنے کا وعدہ لیا جاسکتا تھا اور ہماری متحدہ افواج
ایک طرف کلکتہ اور دوسری طرف مدراس تک پیش قدمی کر کے اس ملک کو انگریزوں کی
چیرہ دستیوں سے نجات دلا سکتی تھیں۔

معظم علی نے جواب دیا: "یہ اس ملک کی ہمتی ہے کہ لعین لوگ نیام سے تلوار
نکالے بغیر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے دشمن کا سر قلم ہو چکا ہے۔ مرہٹوں کو فیصلہ کن منہر کے
سے پہلے اپنی شکست کا یقین ہو چکا تھا لیکن اگر ہم یہ سمجھ لیتے کہ ہمیں رڈائی کے بغیر فتح حاصل
ہو چکی ہے تو یہ ایک بدترین حماقت ہوتی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ مرہٹے کچھ عرصہ بعد
زیادہ تیاریوں کے ساتھ شمال کا رخ کرتے اور ہمیں ان کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ

کی کوشش کرتا لیکن کبھی کبھی وہ اس انداز سے گفتگو کرتا کہ سننے والوں کی نگاہوں کے
سامنے پانی پت کے میلان کی تمام تفصیلات آجاتیں۔

ایک دن اودھ کی فوج کے ایک بڑے افسر نے اسے اپنے ہاں دعوت دی۔
شہر کے چیدہ چیدہ لوگ اور فوج کے کئی افسر اس دعوت میں شریک تھے۔ جب پانی پت
کی جنگ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو شہر کے ایک رئیس نے سوال کیا: جناب آپ
کے خیال میں احمد شاہ ابدالی اور ان کی افواج کے بعد اس جنگ میں سب سے زیادہ حد
کن لوگوں کا ہے؟

معظم علی نے جواب دیا: میں جنگ میں شریک ہونے والے ہر سپاہی کو اس فتح
میں کیساں حصہ دار سمجھتا ہوں۔

دوسرے آدمی نے سوال کیا: لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ روہیلہ کے سپاہیوں
کی بہت تعریف کرتے ہیں؟

معظم علی نے جواب دیا: روہیلہ کے جوانوں نے پانی پت کی جنگ میں حصہ
لینے والے ہر سپاہی کو متاثر کیا ہے اور میں نے احمد شاہ ابدالی کو بھی یہ کہتے سنا ہے کہ
کاش ہندوستان کے باقی امراء کے پاس بھی ایسے سپاہی ہوتے۔

فوج کے ایک افسر نے کہا: معاف کیجیے! روہیلوں کے ساتھ آپ کی محبت
کی وجہ یہ تو نہیں کہ ان کے چند دے آپ کی کمان میں تھے؟

معظم علی نے پرہیز کر کے کہا: اگر میں اودھ کی فوج کا سپر سالار ہوتا تو بھی آپ اسی
طرح میرے منہ سے روہیلوں کی تعریف سنتے۔ میں نے پانی پت کے میدان میں جو کچھ دیکھا
ہے ایک سپاہی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

وہی افسر نے پھر کہا: لیکن جناب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک سپاہی کی نظر سے
دیکھنے کے بعد آپ نے اودھ کی فوج کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے؟ کیا آپ کے خیال میں

کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ جو بے رحم ہاتھ بنگال کے حریت پسندوں کا کھلا گھونٹ چکے ہیں وہ کسی دن ان کی شرگ تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ اگر جات اور مرے دلی یا روہیکھنڈ کے علاقوں میں تباہی مچاتے ہیں تو اودھ، دکن، لاہور یا بلتان کے صوبیدار یہ سمجھ لیتے ہیں کہ آگ ابھی تک ان کے اپنے گھر کی چار دیواری سے دور ہے۔ اسی طرح جب دکن یا اودھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو دوسروں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ برسوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس ملک کے چند امراء ایک اجتماعی خطہ سے خوف زدہ ہو کر ایک جھنڈے تلے جمع ہوئے تھے اور اس اتحاد کے شاندار نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا خطرہ دور ہو چکا ہے۔ اب اگر ہم فری تاجروں کو اس ملک سے نکال نہ سکے یا اگر ہم نے مریشوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو ہماری اس دکانی کا باعث ہمارے اکابر کی نااہلیت اور کوتاہی ہوگی۔

احمد شاہ اہالی کے لیے ہر سانس کے ساتھ میرے دل سے ایک دعا نکلتی رہے گی۔ انھوں نے مجھے ایک باغوت اور باوقار قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے زندہ رہنے کا موقع عطا کیا ہے لیکن اس احسانِ عظیم کے بعد میں ان سے یہ مطالبہ نہیں کر دلا کہ آئیے اب آپ ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر بھی پہرہ دیجیے اور اس بات کا بھی خیال رکھیے کہ مرہٹے جو پانی پت کی جنگ کے بعد نیم جان ہو چکے ہیں۔ کہیں دوبارہ اٹھ کر ہمارے مقابلے پر نہ آجائیں۔ میں ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنی مرکزیت برقرار رکھنے کے لیے ایک برائے نام شہنشاہ کی ضرورت ہے اور جس شخص کو دلی کا تخت سونپا جا رہا ہے اسے امراء کی سازشوں یا دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی آپ کے پہرے کی ضرورت پڑے گی لیکن میں ان لوگوں سے کچھ کہنے کا حق رکھتا ہوں جو اپنے آپ کو قوم کی کشتی کا ناخدا سمجھتے ہیں اور میں ان سے یہ مطالبہ کرنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ خدا کے لیے ہماری دعاؤں سے بہت حاصل کرو۔ اگر تمھاری کوتاہی، غافیت پسندی اور سہل انگاری کے باعث قوم

ہو ناک جنگ لڑنا پڑتی۔ مرہٹوں کے ساتھ مصالحت کے حق میں ہمارے ملک کے وہ سیاست دان تھے جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنے تدریجاً مذہب کے بل بوتے پر مرہٹوں کی جارحیت کو اپنی سرحدوں سے دور رکھ سکتے ہیں لیکن نجیب الدولہ ایک حقیقت پسند انسان ہیں وہ جانتے تھے کہ مرہٹوں کو ایک فیصلہ کن جنگ ہی راہ راست پر لاسکتی ہے۔ آپ میں سے کسی کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ مرہٹے جو گذشتہ چند برس میں سینکڑوں شہر اور ہزاروں بیتیاں تاخت و تاراج کر چکے ہیں، پانی پت کے میدان میں پہنچنے کے بعد اچانک جنگ سے متحضر ہو گئے تھے اور آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اگر انھیں دلاں سے بچ نکلنے کا موقع دے دیا جاتا تو وہ واپس جاتے جاتے دلی سے دکن تک راستے کی ہر پستی کو تباہی دیر بادی کا پیغام نہ دیتے اور پھر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سیدھے گھر جانے کی بجائے آگرہ اور لکھنؤ جیسے شہروں کو اپنے راستے کی منزلیں بنانے کی کوشش نہ کرتے! مجھے افسوس ہے کہ آپ میں سے بہت کم لوگوں کو اس سیلاب کا صحیح اندازہ ہے جو پونا سے نکل کر پانی پت تک پہنچ گیا تھا۔ آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اس سیلاب کے راستے میں ایک عظیم ہتھیار ڈال دیا اور نہ اس ملک کے جو امراء اپنی فراست اور تدبیر پر فخر کرتے ہیں ان میں یہ سکت نہ تھی کہ وہ اس طوفان کی معمولی لہروں کا بھی مقابلہ کر سکتے۔ احمد شاہ اہالی نے ہمیں اس وقت سہارا دیا ہے جب ہم تباہی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اب اگر ہم انسانوں کی طرح زندہ رہنا سیکھیں اور ہمارے امراء انفرادی خود کشی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے متحد اور منظم ہو کر اجتماعی بقا کے لیے جدوجہد کریں تو ہم کسی وقت کا سامنا کیے بغیر اس ملک کو انگریزوں کی ہوس تک گیری سے بچا سکتے ہیں۔

قوم کی موت و حیات کے مسائل سے ہماری قسمت کے ناخداؤں کی بے حسی کا اس سے بڑا اثرات اور کیا ہو سکتا ہے کہ انگریز بنگال کی آزادی پر چھا رہا ہے۔ میں تو ان میں سے

حکومت پر نکتہ چینی کرنے سے اجتناب کرتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے احساسات کی تلخی بڑھتی گئی۔ تجارت کار باسما کا رد بار عملی طور پر شیعہ علی کے سپرد کرنے کے بعد وہ اپنا بیشتر وقت قوم کے مستقبل پر سوچنے میں صرف کرتا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر یہ خیال بری طرح حاوی ہو رہا تھا کہ ملک کے امراء اگر نئے حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں تو بنگال کو انگریزوں کے نیچے استبداد سے نجات دلانی جاسکتی ہے اور کرناٹک میں ان کی سازش کا سد باب ہو سکتا ہے۔ مرہٹوں کے متعلق بھی وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ انھیں دوبارہ سراٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ ادھر پنجاب میں سکھوں کے حوصلے مسلمانوں کے لیے ایک نیا خطرہ بن چکے تھے اور معظم علی کے نزدیک ہر الجھن، ہر پریشانی کا واحد علاج یہ تھا کہ سلطنت کے تمام صوبیدار اور امارات منظم اور متحد ہو کر قوم کے حال اور مستقبل کے مسائل پر غور کریں اور ان مسائل سے عمدہ براہوں کے لیے عوام میں ایک اجتماعی احساس بیدار کریں۔ پانی پت کی جنگ اس کے نزدیک ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نئے دور کا پیش خیمہ تھی لیکن یہ تلخ حقیقت اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی کہ امراء کی بے حسی بتدریج عوام کے اٹھتے ہوئے حوصلوں اور ولولوں پر غالب آ رہی ہے۔ وہ کھنڈ کے امراء سے ملتا اور انھیں یہ سمجھاتا کہ اگر ہم نے ان حالات سے فائدہ نہ اٹھایا تو اندیشہ ہے کہ قوم پھر ایک بار مایوسی اور بے بسی کے دہل میں جاگے گی اگر ہمارے اکابر اپنی سیاسی سودا بازیوں اور محلاتی سازشوں پر اعتماد کرنے کی بجائے عوام کے جذبات و مخالفت پر اعتماد کریں تو ہم چند ماہ کے اندر اندر مٹھی بھر انگریزوں کو خلیج بنگال کے گہرے پانیوں کی طرف دھکیں سکتے ہیں۔ مرہٹوں کے لیے ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے سراٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ اگر صرف اودھ اور دکن کی حکومتیں صرف چند مہینوں کے لیے اتحاد کر لیں تو جنوبی ہندوستان کو انگریزوں اور فرانسیزیوں کی چیر دہستیوں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلانی جاسکتی ہے۔

معظم علی کبھی آدھی آدھی رات تک گھر میں بیٹھ کر دکن، لاہور، ملتان اور سرسہند

کی نیا ڈوب گئی تو تم بھی اس کے ساتھ ہی ڈوب جاؤ گے۔

آپ میں سے کسی کو اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ میں پانی پت کی جنگ میں حصہ لینے والے دو پہلے جانناؤں کی تعریف کرتا ہوں۔ میں وہ پہلے کھنڈ کا دوست ہوں نہ اودھ کا دشمن۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت میں میں ان سب کو اپنے ملی وجود کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ پانی پت کی جنگ میں شہید ہونے والے افغان، مثل، بلوچ اور ہندی مسلمان سب میرے محسن تھے۔ ان کا مقدس خون میری عزت، میری آزادی اور میری سر بلندی کے لیے بہا ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس خون کی دوستی سے میرے اور میری قوم کے مستقبل کی تاریخ کے بہترین صفحات لکھے جائیں۔

جب یہ محض برخاست ہو رہی تھی تو کھنڈ کا ایک عمر رسیدہ آدمی معظم علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے میزبان کے گھر سے باہر نکلا اور اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا: آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ شجاع الدولہ کے کانوں تک پہنچا جائے گا؟

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا: خدا شاہد ہے کہ میں نے یہ تمام باتیں شجاع الدولہ کے لیے ہی کہی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا نیک اقدام قوم کے لیے خیر و برکت کا باعث ہو سکتا ہے اور جن کی کوتاہیوں سے لاکھوں انسانوں کے لیے تباہی اور بربادی کے راستے کھل سکتے ہیں۔



کھنڈ میں معظم علی کی بڑھتی ہوئی عزت اور شہرت کے ساتھ اس کے خلاف وہ عیب جو اور حامد لوگ بھی بیلہ ہو چکے تھے جو کسی انسان کی تعریف کو اپنی مذمت کے مترادف سمجھ لیتے ہیں وہ امراء جو ابتلا میں اس کے ساتھ محبت اور احترام سے پیش آئے تھے۔ اب اپنے طنز و طعنے سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ منہ نشیوں اور کورنش بجالانے والوں یا خواجوں اور خواہ برادر کی دنیا میں ایک حق گو اور مہیاک انسان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ابتداء میں معظم علی اودھ کی

کے صوبیداروں، دلی کے وزیروں اور امیروں اور دوسرے کھنڈ کے سرداروں کے نام اس قسم کے خطوط لکھتا :-

ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ احمد شاہ ابدلی بار بار ہماری اعانت کے لیے نہیں آئیں گے۔ اگر آپ متحد ہو جائیں تو گئی گزری حالت میں بھی اس ملک کی کوئی طاقت آپ کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ آپ اس ملک کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے محافظ ہیں۔ اگر آپ نے موجودہ حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تو آپ خدا کے سامنے کیا جواب دیں گے؟ پانی پت کی فتح کے بعد اس ملک کے مایوس اور بددل مسلمانوں میں جو حوصلے اور دلولے بیدار ہوئے تھے وہ اب سرد پڑتے جا رہے ہیں۔ آپ کو اس وقت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنے حال سے ایوک اور مستقبل سے بے پروا ہو جائیں۔ ہماری سب سے بڑی بیماری لامرکزیت ہے۔ اگر آپ متحد اور منظم ہو جائیں تو دلی کے تخت کا کھویا ہوا دھار بحال کیا جاسکتا ہے لیکن اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاہ عالم ثانی جو ابھی تک جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے قوم کی ڈھال اور تار نہیں بن سکتا تو خدا کے واسطے سے... جو اٹھنے کے لیے کسی ایسے آدمی کو آگے لانے کی کوشش کیجیے جس کی صلاحیتوں پر اعتماد کیا جاسکے۔ میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ ایک قوم کا مستقبل کسی نااہل علوان کی ذاتی خواہشات پر قرار کیا جاسکتا ہے۔ میں اس ملک کے کرداروں مسلمانوں کی عزت آزادی اور بقا کا واسطہ دے کر آپ سے راجا کرتا ہوں کہ آپ اپنے فرائض کا احساس کریں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ان ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے جو قوم کی آزادی کے پاسان ہونے کی حیثیت سے آپ پر عائد ہوتی ہیں تو میری آخری

درخواست یہ ہے کہ آپ قوم کے راستے سے ہٹ جائیں اور ایسے لوگوں کو آگے آنے کا موقع دیں جو قوم کا بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہوں :-



ایک دن معظم علی اپنے دفتر میں بیٹھا انتہائی انہماک کی حالت میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اکبر خاں کمرے میں داخل ہوا اور بے پاؤں آگے بڑھ کر اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ صابر دروازے پر کھڑا بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکبر خاں دیر تک چپ چاپ بیٹھا ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ معظم علی کی طرف دیکھتا رہا۔ متوڑی دیر بعد معظم علی لکھا ہوا کاغذ رکھ کر دوسرا کاغذ اٹھانے لگا تو اچانک اس کی نگاہ اکبر خاں پر جا پڑی۔

بھائی جان، السلام علیکم! اکبر خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے ہوئے کہا۔

معظم علی "علیکم السلام" کہہ کر اٹھا اور اس سے ہاتھ ملانے کے بعد بغلیں ہو کر بولا "تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

"میں ابھی آیا ہوں بھائی جان! آپ اطمینان سے اپنا کام ختم کر لیجیے۔"

"بیٹھو، میرا کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔"

وہ بیٹھ گئے اور اکبر خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا "بھائی جان ابھی صاف مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ آپ دن رات لکھتے رہتے ہیں اور اپنی صحت کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ بھابی جان کیسی ہیں؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں کئی دنوں سے تمہارے ہاں جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تم اتنا عرصہ کہاں تھے۔ کم از کم اپنی خیریت کی اطلاع تو بھیج دی ہوتی۔"

اکبر خاں نے جواب دیا: "بھابی جان یقین کیجیے کہ میں ہر روز آپ کی خدمت میں

حاضر ہونے کا ارادہ کیا کرتا تھا۔ دو ماہ قبل ہمارے علاقے کا ایک آدمی لکھنؤ آ رہا تھا اور میں نے اسے ایک خط دیا تھا۔ پچھلے ہفتے وہ مجھے ملا اور اس نے بتایا کہ گھر سے نکلنے کے بعد میرا ارادہ بدل گیا تھا اور میں لکھنؤ کی بجائے اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے کے لیے آگرہ چلا گیا تھا۔

معظم علی نے کہا: "شیخ فخر الدین ہر خط میں تمہارے متعلق پوچھا کرتے ہیں۔ میں نے پرسوں ہی انھیں لکھا ہے کہ اکبر خاں نے مدت سے کوئی اعلان نہیں بھیجا اور عنقریب اس کے گاؤں جا رہے ہوں۔ شیخ صاحب تم سے بہت پیار کرتے ہیں اور وہ مضر ہیں کہ میں حیدر آباد آؤں تو تمہیں ساتھ لے کر آؤں۔"

"وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں بھی انھیں بہت یاد کیا کرتا ہوں۔ اگر آپ حیدر آباد گئے تو میں ضرور آپ کا ساتھ دوں گا۔"

معظم علی نے کہا: "اب معلوم نہیں کہ مجھے کہاں کہاں جانا پڑے۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ میں زیادہ عرصہ لکھنؤ میں نہیں رہ سکوں گا۔ نواب شجاع الدولہ کے خوشامدی اور جی حضور مجھ سے بہت خفا ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے ایک بڑے اہلکار نے مجھ سے گلہ کیا تھا کہ میں لکھنؤ میں بغاوت پھیل رہا ہوں۔"

اکبر خاں نے کہا: "بھائی جان! میں نجیب الدولہ کی دعوت پر پچھلے ہفتے چند دنوں کے لیے ولی گیا تھا اور انھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ شجاع الدولہ آپ جیسے حق گو آدمی کا زیادہ عرصہ لکھنؤ میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔ آپ نے انھیں کوئی چٹھی لکھی تھی؟"

معظم علی نے جواب دیا: "ان دنوں میرا سب سے بڑا مشغلہ اس ملک کے اکابر کے نام خطوط لکھنا ہے اور اس وقت بھی میں میرے نظام علی کے نام ایک خط لکھ رہا تھا۔"

میرے نظام علی کو آپ نے کیا لکھا ہے؟

میں نے مرہٹوں کے خلاف اس کی تازہ فتوحات پر اسے مبارکباد دی ہے تمہیں

معلوم ہے کہ وہ مرہٹوں سے حیدر آباد کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے چکا ہے۔ شیخ فخر الدین کی رائے اس کے متعلق اچھی نہ تھی لیکن پچھلے خط میں انھوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ میں نے نظام کو لکھا ہے کہ آپ اس ملک کے امرا کو اجتماعی خطرے کے مقابلے میں متحد اور منظم کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ تم یہ خط پڑھ سکتے ہو۔ معظم علی نے یہ کہہ کر لکھے ہوئے کاغذ میز پر سے اٹھائے اور اکبر خاں کے ہاتھ میں دے دیے۔

اکبر خاں نے خط پڑھنے کے بعد معظم علی کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا: بھائی جان! آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے اور چچا شیر علی کہاں ہیں؟

معظم علی نے جواب دیا: "پانی پت کی جنگ سے لوٹنے کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا۔ بیشتر کام چچا شیر علی نے سنبھال رکھا ہے اور وہ چند دنوں سے فیض آباد گئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آج یا کل آجائیں گے۔"

صابر ایک کم سن بچہ اٹھلے کمرے میں داخل ہوا اور اسے اکبر خاں کی گود میں رکھتے ہوئے بولا: "بھائی کون ہے؟"

اکبر خاں مسکرایا اور اس نے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا: "یہ میرا خفا متا لاڈلا بیٹا ہے اور کسی دن یہ اس ملک کی عظیم ترین فوج کا سپہ سالار بنے گا۔"

پانچ دن بعد معظم علی، اکبر خاں اور شیر علی ایک کمرے میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اچانک باہر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور مقنن دیویر لاجہ دلاؤں انتہائی بدحواسی کی حالت میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور اس نے کہا: "جناب شہر کا کووال آپ سے ملنا چاہتا ہے، اس کے ساتھ پانچ مسلح سپاہی ہیں۔"

معظم علی نے اطمینان سے جواب دیا: "کووال سے پوچھو اگر انھیں ناشتا کرنا ہو تو یہاں تشریف لے آئیں ورنہ انھیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دو اور کہیں ابھی آجائیں۔"

دلادریاں نے کہا۔ "جناب میں نے کہا تھا کہ آپ تاشقند کر رہے ہیں لیکن وہ فوراً آپ سے ملنے پر مصر تھے۔"

معظم علی نے ذرا تلخ ہو کر کہا۔ "جاؤ اسے کہہ دو میں ابھی آتا ہوں اور میرے لیے ایک گھوڑے پر زین بھی ڈال دو۔"

دلادریاں کمرے سے باہر نکل گیا تو معظم علی نے کہا۔ "اگر معلوم ہوتا ہے کہ مجھے شجاع الدولہ نے یاد کیا ہے، اگر مجھے کسی وجہ سے دیر لگ جائے تو تم اپنی بھابی اور ان کی والدہ کو حیدرآباد پہنچا دینا۔ میں انشا اللہ وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں کئی ہفتوں سے شجاع الدولہ کے پیغام کا انتظار کر رہا تھا۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "بھابی جان اگر کوئی خطرے کی بات ہو تو آپ کو شجاع الدولہ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ حیدرآباد کی نسبت میرا گھر یہاں سے نزدیک ہے اور ہم کسی وقت کے بغیر کو قوال اور اس کے آدمیوں کو کسی کوٹھڑی میں بند کر کے یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔"

معظم علی مسکرایا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ آدمی مجھے گرفتار کرنے کی نیت سے نہیں آئے ہیں اور نہ ہی میرا قید ہونے کا ارادہ ہے۔"

اکبر خاں نے کہا۔ "بھابی جان میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"نہیں!" معظم علی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تم یہیں رہو۔ تمہیں اس کمرے سے نکلنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

معظم علی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور شیر علی جو سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا اپنے طبق میں اٹکا ہوا لقمہ لنگنے کے بعد شکایت کے لہجے میں بولا۔

"انہوں نے کبھی میرا کہا نہیں مانا میں ان سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو لوگ قوم اور ملک کے خیر خواہ بن کر آپ کے پاس آتے ہیں ان میں سے آدھے حکومت کے جاسوس ہوتے ہیں

لیکن خدا معلوم پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ بھری محفل میں حکومت کے بڑے بڑے عہدیداروں پر نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔"

اکبر خاں نے اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکنے کے بعد شیر علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "چچا جان پانی پت کی جنگ کے بعد اس ملک کے لاکھوں انسانوں میں زندہ رہنے کی خواہش بیدار ہو گئی ہے اور بھابی جان کے منہ سے ان لاکھوں انسانوں کے دل کی دہنی ہوئی آواز نکلتی ہے۔"

"لیکن اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں چچا جان، آپ پریشان نہ ہوں۔ موجودہ حالات میں شجاع الدولہ ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

سمن میں مسلح سپاہی اپنے گھوڑوں کی باگیں تھامے ڈیوڑھی کے سامنے کھڑے تھے۔ معظم علی کو قوال کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ملاقات کے کمرے سے باہر نکلا۔

اکبر خاں نے شیر علی سے کہا۔ "چچا جان میں ابھی آتا ہوں۔"

شیر علی نے کہا۔ "خدا کے لیے معظم علی کو یہ ضرور سمجھاؤ کہ شجاع الدولہ ایک تند مزاج آدمی ہے وہ اس کے ساتھ بات کرنے میں احتیاط کریں۔"

چچا آپ اطمینان رکھیں۔ "اکبر یہ کہہ کر آگے بڑھا۔ معظم علی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اکبر مجھے نواب وزیر اودھ نے کسی ضروری کام سے بلایا ہے میں جلد واپس آ جاؤں گا۔"

مقررہ دیر بعد معظم علی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کو قوال اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ شہر کا رخ کر رہا تھا۔

"معظم علی نواب شجاع الدولہ کی مسند کے سامنے کھڑا تھا اور منہ سے آگے واپس بائیں

دو قطاروں میں چند امرار اور عمدہ دار بٹھے ہوئے تھے۔ شجاع الدولہ نے چند تانیر اس کی طرف دیکھنے کے بعد کہا: "مجھے تمہارے دو خط ملے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہیں سلطنت کے ہر چھوٹے بڑے عمدہ دار کے نام خط لکھنے کا شوق ہے۔ آخر تم نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ میں حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے تمہارے نیک مشوروں کی ضرورت ہے؟"

معلم علی نے جواب دیا: "اگر مجھے اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ آپ کے ساتھ لاکھوں انسانوں کی قسمت وابستہ ہے اور آپ کا صحیح قدم قوم کے لیے خیر و برکت اور آپ کی معمولی کوتاہی اس کے لیے تباہی کا باعث ہو سکتی ہے تو میں آپ کو ہرگز پریشان نہ کرتا۔"

لیکن تمہیں ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت کا حق کس نے دیا ہے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ صرف اپنی تجارت سے سرکار رکھو اور لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرو کہ قدرت نے سلطنت کا سارا بوجھ تمہاری گردن پر لا دیا ہے؟ ہم یہ برداشت نہیں کریں گے کہ جو لوگ بنگال کو تباہی کے راستے پر ڈال کر وہاں سے بھاگے ہیں وہ یہاں آکر ہمارے لیے کوئی فتنہ پیدا کریں۔"

معلم علی ایک مبلغ کا جذبہ لے کر شجاع الدولہ کے دربار میں داخل ہوا تھا لیکن یہ الفاظ اسے چابک کی طرح لگے اور اس نے جواب دیا: "معاف کیجیے مجھے اس سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے کھنڈروں پر اقتدار کی مسندیں آرام سے کرنے والے امرار اپنے آپ کو کبھی مرٹھوں، کبھی جاٹوں، کبھی انگریزوں اور کبھی فرانسیسیوں کے سامنے بے بس پاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری آواز آپ کے کانوں کے لیے غیر مانوس ہوگی لیکن اقتدار کی مسند کسی شخص کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی قوم کی عزت اور آزادی پر جان دینے والوں کا مذاق اڑائے۔ بنگال میں میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں اپنی زندگی کی ہزاروں خوشیاں اپنی قوم کی عزت اور آزادی پر قربان کر چکا ہوں۔"

میرا باپ، میرا بھائی، میرے عزیز اور میرے دوست سراج الدولہ کے جھنڈے تلے قربان ہو چکے ہیں لکھنؤ پہنچ کر میں نے یہ جرم کیا ہے کہ جب مجھے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اسی تک میری رگوں میں خون کے چند قطرے باقی ہیں جو قوم کے کام آسکتے ہیں تو میں ایک رضا کار کی حیثیت میں پانی پیت کے میدان میں پہنچ گیا تھا۔"

شجاع الدولہ نے جواب دیا: "پانی پیت کی جنگ میں اس ملک کے ہزاروں انسان جھڑپے پیکھے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ حکومت کے خلاف بغیانہ بھڑکیں گے تم ہمارے خلاف کئی مہینوں سے نفرت پھیلا رہے ہو۔ تم نے ہم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ہم جنگ کے دوران میں مرٹھوں کے ساتھ ساز باز کرتے رہے ہیں۔ تم نے شہنشاہ کے خلاف انتہائی توہین آمیز باتیں کہی ہیں۔ تم نے دلی میں احمد شاہ ابدلی کو ہمارے خلاف بھڑکا کر کوشش کی ہے کہ پانی پیت کی جنگ میں اودھ کی افواج کی حیثیت تمنا پٹوں سے زیادہ نہ تھی۔ ہم تمہیں روسیوں کی طرف داری سے منع نہیں کر سکتے لیکن تمہیں نجیب الدولہ یا حافظ رحمت خاں کے اشاروں پر ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لکھنؤ میں تمہاری خدمات کا احساس نہ ہوتا تو ہم ایک تانیر کے لیے بھی تمہارا یہاں رہنا گوارا نہ کرتے۔"

معلم علی نے ایک تانیر کے لیے حاضرین دربار کی طرف دیکھا اور پھر شجاع الدولہ کی آنکھوں میں ڈال کر جواب دیا: "مجھے معلوم نہیں کہ میرے دوستوں نے میرے متعلق آپ کو کسی اطلاعات پہنچائی ہیں۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ میں آپ کے خلاف کوئی بغاوت پھیلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ میں اس ملک کے موجودہ حالات سے مطمئن نہیں ہوں اور کوئی باشعور آدمی ان حالات سے مطمئن نہیں ہو سکتا، میں آپ کے سامنے ایک ایسی قوم کے فرد کی حیثیت میں کھڑا ہوں جس کا ہر قدم تباہی کی طرف اٹھ رہا ہے۔ درآپ اس ملک کے ان چند انسانوں میں سے ایک ہیں جو اسے تباہی سے بچا سکتے ہیں پانی پیت۔"

دیکھ سکتا اور پھر یہی افواج پنا سے آگے اڑا کر اس کی طرف بڑھتیں اور اس ملک سے ان فرجی ہاجروں کو نکال کر دم لیتیں جو ہماری عزت اور آزادی کا سودا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس کے بعد شاید بنگال کو آزاد کرنے کے لیے ہمیں لڑنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

شجاع الدولہ نے قدمے نرم ہو کر کہا: "تم ہمارے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے کسی مرحلہ پر دوسرے امرار سے تعاون نہیں کیا۔ جب مرہٹوں کا خطرہ پیش آیا تھا تو ہم پانی پت کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ تھے اور اب بھی اگر کسی مشترکہ دشمن کے مقابلے میں اس ملک کے امرار نے کوئی متحدہ محاذ بنایا تو ہم ان کا ساتھ دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ یکی ہماری حکمت عملی کسی ایسے حلیف کی خواہشات کی تابع نہیں ہو سکتی جس کی وفاداری پر ہمیں پورا بھروسہ نہ ہو۔ تم ہمیں نظام الملک کے ساتھ تعاون کا مشورہ دیتے ہو لیکن تمہارے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر ہم نظام کی حمایت کے لیے اٹھیں تو وہ مرہٹوں کے ساتھ سودا نہیں کرے گا؟"

معظم علی نے جواب دیا: "میں آپ کو نظام کے لیے نہیں، دکن کے مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے لیے مرہٹوں کے خلاف میدان میں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا مقصد صرف امرار کا اتحاد ہی نہیں بلکہ عوام میں ایک ایسا اجتماعی شعور اور ایک ایسی قوت محاسبہ پیدا کرنا ہے جس کا احترام اور خوف کسی رہنما کو بے راہ ردی کی اجازت نہ دے۔"

شجاع الدولہ نے طنزیہ لہجے میں کہا: "تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے دکن جا کر وہاں کے عوام کا ضمیر بیدار کرو؟ مجھے آج ہی یہ اطلاع ملی ہے کہ میر نظام علی نے جسے تم شاید قوم کا نجات دہندہ سمجھتے ہو۔ مرہٹوں کے خلاف جنگ سے واپس لوٹتے ہی اپنے بھائی صلابت جنگ کو گدی سے اتار کر قید خانے میں ڈال دیا

کی جنگ کے بعد قدرت نے ہمیں عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے لیکن اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو قدرت شاید ہماری اس کوتاہی کو قابلِ معافی نہ سمجھے۔ اگر ہمارے امرار اور صوبیداروں نے متحد اور منظم ہو کر مرکز کو مضبوط نہ کیا تو مرہٹوں کو دوبارہ سر اٹھانے میں دیر نہیں لگے گی اور ہمارے اکابر کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ جب کوئی نیا طوفان آئے گا تو قدرت ان کی اعانت کے لیے کسی اور احمد شاہ بدلی کو بھیج دے گی۔ مرہٹوں سے بھی زیادہ خطرناک اس وقت ہمارے لیے انگریز ہیں لیکن ہماری اس سے زیادہ بد قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے امرار نے بنگال کے واقعات سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ہم اس جنگ میں رہتے ہیں جس کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور میرے پیچھے اور پیچھے کی دجہ صرٹ یہ ہے کہ میں کھٹو سے اس آگ کے شعلے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس آزدی کی ہنگامیں سن رہا ہوں جو بنگال کو ٹھپ کر چکا ہے۔ میں ان بھیڑیوں کی چیخیں سن رہا ہوں جو ایک بار پھر مہاراشٹر سے نکل کر اس ملک میں تباہی پھیلانا چاہتے ہیں۔ پھر جب میں اپنے ان اکابر کو دیکھتا ہوں جو اجتماعی خجرات کے مقابلے کے لیے علام کی قوتِ ملت بدلا کر کرنے کی بجائے اپنی سیاسی چالوں اور سودا بازیوں کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو میں غموش نہیں رہ سکتا۔ میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ اگر تم نے انگریزوں کے جواز نہ خرچ کیا تو وہ کسی دن دلی پہنچ جائیں گے۔ اگر تم نے مرہٹوں کی جارحیت کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا تو تمہاری آئندہ نسلیں تم پر لعنت بھیجیں گی۔ اور اگر تم نے پنجاب میں سکھوں کی سرکوبی کے لیے افغانوں کا ساتھ دیا تو شمال میں تمہارا ام ترین دفاعی حصار ٹوٹ جائے گا مگر اس قسم کے خیالات کا انکار جرم ہے تو میں اس جرم کی سزا بھیجتے کے لیے تیار ہوں۔ دلی سے احمد شاہ بدلی کی واپسی کے بعد میں نے صرف ایک حوصلہ افزا خبر سنی ہے اور وہ یہ ہے کہ نظام کی افواج نے مرہٹوں سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے ہیں لیکن کاش میں اودھ، دلی اور روہیلکھنڈ کی افواج کو بھی دکن کی افواج کے دوش بوش

دشمنوں کے خلاف کوئی جرات مندانہ قدم اٹھانے کا تو ہم اس کا ساتھ دیں گے اور اگر تمہیں اس مہم میں ناکامی ہوئی تو اس کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ تم ہر معاملے میں ہمیں مدد فراہم ٹھہرانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ ہم خوشی تمہیں اس بات کی بھی اجازت دیتے ہیں کہ تم ملک کے کونے کونے میں جا کر ہر با اثر آدمی کو ہماری طرف سے یہ پیغام دو کہ مسلمانوں کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کے خلاف جو متحدہ محاذ بنایا جائے گا اودھ کے تمام وسائل اس کی فوج اور کامیابی کے لیے وقف ہوں گے لیکن اگر تم لوگ صرف باتیں بنانا جانتے ہو تو میں تم سے یہ کہوں گا کہ اودھ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے خیریب الدولہ نے کہا تھا کہ تم ایک کارآمد آدمی ہو اور میں تمہیں قوم کی خدمت کا موقع دینا چاہتا ہوں۔ میں اب تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم حیدر آباد جانا چاہتے ہو یا نہیں لیکن میں تم سے یہ توقع منڈو رکھوں گا کہ جب تک تم کھنڈ میں ہو میرے پاس اس قسم کی کوئی شکایت نہیں آئے گی کہ اس ملک کی تمام برائیاں میری ذات کے ساتھ وابستہ کی جا رہی ہیں۔ تم جاسکتے ہو؟

مظفر علی نے چند ثانیے تذبذب کی حالت میں شجاع الدولہ اور حاضرین مجلس کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اہل دربار پریشانی، اضطراب اور تذبذب کی حالت میں اس شخص کی طرف دیکھ رہے تھے جس کے سامنے ذرا سی گستاخی موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ مظفر علی کے ساتھ کھٹکے کے دوران میں وہ ہر لمحہ اس بات کے منتظر تھے کہ شجاع الدولہ اچانک تالی بجائے گا اور سپاہی تنگی تلواروں کے پھرے میں اس گستاخ آدمی کو کسی تنگ دانہ کی کٹھڑی کی طرف لے جائیں گے اور مظفر علی کے کمرے سے نکل جانے کے بعد بھی وہ یہ سوچ رہے تھے کہ شاید شجاع الدولہ پر بیادوں کو کھڑا دے کر یہ کہہ دے کہ اس گستاخ آدمی کو محل کے دروازے سے باہر نکلے ہی گرفتار کر لیا جائے لیکن شجاع الدولہ کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے اہل مجلس کو حیران اور پریشان دیکھ کر کہا۔ تمہیں یہ شکایت تھی کہ ایسے خطرناک آدمی کو کھنڈ میں نہیں رہنا چاہیے

ہے۔ ان حالات میں تم مجھے صلابت جنگ کی اعانت کا مشورہ دیتے ہو یا میرا نظام علی کی اعانت کا مظہر علی نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میرے لیے یہ کمیل نیا نہیں۔ جب تک چند خاندان سلطنت مغلیہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اپنی شکار گاہیں سمجھتے رہیں گے اور جب تک دلی کی حکومت میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ اقتدار کے بے حیا دعویٰ اوروں کا مقابلہ کر سکے، اس ملک کے مختلف صوبوں میں اس قسم کے کمیل ہوتے رہیں گے۔

شجاع الدولہ نے کہا: دلی کی حکومت کی طرف سے میں تمہیں یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اگر ہم اس وقت دکن کے معاملات میں مداخلت کریں تو میرا نظام علی، مرہٹوں یا انگریزوں کے ساتھ سودا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اور یہی بات صلابت جنگ کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ ہمارے متعلق تمہارا یہ قیاس غلط تھا کہ ہم دکن اور مرہٹوں کی جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے لیکن کاش دکن میں کوئی ایسی شخصیت ہوتی جسے صحیح معنوں میں ہم اپنا حلیف سمجھ سکتے۔ میرا نظام علی کے متعلق اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ہوشیار سپاہی اور ایک کامیاب سیاست دان ہے اور قرآن یہ بتا رہے ہیں کہ دکن پر اس کی سیادت تسلیم کر لی جائے گی لیکن ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قوم اور ملک کے مستقبل کے متعلق میرا نظام علی کے عزائم کیا ہیں مگر تم اپنی مرگرمیاں صرف اودھ کی حکومت پر مرکوز چینی تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تو ہماری یہ خواہش ہے کہ تم دکن کو جادو میرا نظام کو حال اور مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرو اور اگر اسے تمہاری باتیں متاثر نہ کر سکیں تو یہ معلوم کرو کہ دکن کو تباہی سے بچانے کی کوئی اور صورت کیا ہو سکتی ہے! دکن کے امراء میں سے کئی تمہیں اپنے ہم خیال مل جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ اگر میرا نظام علی اتنا ہی بوجہ اندیش ثابت نہ ہوتا تو تم ایسے لوگوں کی مدد سے اسے اپنا ہم خیال بنا سکو گے اور تم تمہارے ساتھ یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار رہیں کہ جب میرا نظام ہمارے مشترک

درمجھے یقین ہے کہ اب وہ لکھنؤ میں نہیں رہے گا۔ ایسا آدمی اپنی ذات کے سوا کسی کے لیے خطرناک نہیں ہو سکتا۔“

ایک درباری نے اسے اٹھ کر کہا: لیکن عالیجاہ! اس نے حضور کے سامنے بھی انتہائی گستاخی کا مظاہرہ کیا ہے۔

شجاع الدولہ نے جواب دیا: ”تم اس بات پر حیران ہو کہ میں اس کے ساتھ نرمی سے کیوں پیش آیا۔ سنو! وہ نجیب الدولہ اور حافظہ رحمت خاں جیسے لوگوں کا دوست ہے، اگر اس پر سختی کی جاتی تو یہ لوگ میرے خلاف طوفان کھڑا کر دیتے۔ احمد شاہ ابدالی سے کفریہ پلٹ کر بھارت میں آئے تھے، اس پر میری اپنی فوج کے بڑا دل جو ان پانی پت کے میدان میں اس کے بہادرانہ کارناموں کے معترف ہیں۔ پھر اس کی باتیں سننے کے بعد تم اسے بڑباز اور گستاخ کہہ سکتے ہو لیکن اس پر بدعتی کا الزام عائد نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے لیے سردروی کا باعث تھا لیکن میں نے یہ سردروی اب نظام کی طرف منتقل کر دی ہے اور مجھے نظام سے پوری توقع ہے کہ وہ اس کا صحیح علاج کر سکے گا۔ نظام سے یہ بعید نہیں کہ وہ اسے مہلا ایک جاسوس سمجھے اور یہ حضرت حیدر آباد پیچھے ہی لاپتہ ہو جائیں۔“

ایک درباری نے سوال کیا: لیکن عالیجاہ اگر وہ یہاں سے نہ گیا تو؟
شجاع الدولہ نے کہا: ”شہر کا کوئی توال اس بات کا پورا خیال رکھے گا کہ وہ کسی تانیر کے بغیر لکھنؤ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے۔“

معظم علی اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اکبر خاں ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر معظم علی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا: بھائی جان میں آپ کے متعلق بہت پریشان تھا۔ کیسے وہاں کیا ہوا؟

کچھ نہیں: معظم علی نے گھوڑے سے اترتے ہوئے جواب دیا: شجاع الدولہ کی خواہش ہے کہ میں لکھنؤ چھوڑ کر حیدر آباد چلا جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس نے

میرے لیے قید خانے کی کوٹھڑی منتخب نہیں کی۔“

اکبر خاں نے کہا: ”اس نے آپ کو لکھنؤ سے نکل جانے کا حکم دیا ہے؟“
نہیں! اسے اس بات کا یقین تھا کہ میں ایسا حکم نہیں مانوں گا اور اس کی اٹھنوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں لکھنؤ کی بجائے حیدر آباد جا کر قوم کے مسائل حل کرنے کی کوشش کروں۔“

اکبر خاں نے کہا: ”بھائی جان اگر آپ لکھنؤ چھوڑ کر میرے ہاں جانا قبول کریں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ اودھ کی نسبت روہیلکھنڈ میں یوں بھی آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”ابھی میں نے مستقل طور پر لکھنؤ چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب ایسا وقت آئے گا تو تمہارا گھر میری آخری جائے پناہ ہوگی لیکن ابھی میں حیدر آباد جانا چاہتا ہوں۔ میں شیخ فخر الدین سے کئی بار وعدہ کر چکا ہوں اور اب شجاع الدولہ نے اس وعدے کو پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیے ہیں۔ تمہاری بھابی کو بھی حیدر آباد دیکھنے کا شوق ہے۔“

اکبر خاں نے پوچھا: ”آپ کب جا رہے ہیں؟“
میں انتشار اللہ ایک ہفتے کے اندر اندر روانہ ہو جاؤں گا۔“
اکبر خاں نے کہا: ”بھائی جان میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“

بچہ ہے !

عطیہ چند ثانیے بے حس و حرکت بیٹھی بچے کی طرف دیکھتی رہی۔ پیراچاک اس نے اپنے دل میں جذبات کا تلاطم محسوس کیا اور بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

بلقیس نے کہا: ”چلیے آپا جان وہ آپ کے متعلق پوچھتی تھیں“

”تم چلو میں آتی ہوں۔“

بلقیس نے اس کی گود سے بچہ اٹھا لیا اور باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد عطیہ جھپکتی ہوئی ننھی منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئی فرحت اور اس کی والدہ فخر الدین کے خاندان کی چند خاتون کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں۔ عطیہ انہیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔

بلقیس نے فرحت کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”بھابی جان! یہ عطیہ آپا ہیں“

فرحت نے مسکرا کر عطیہ کی طرف دیکھا اور پھر بلقیس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”تمہیں دیکھنے کے بعد تمہاری بہن کو پچھتاوا میرے لیے مشکل نہیں۔ تمہاری صورتیں بہت ممتی ہیں“

عطیہ بڑی عمر کی خواتین اور اپنی ماموں زاد بہنوں کی مجلس میں فرحت کے ساتھ

بے تکلفی سے کوئی بات نہ کر سکی لیکن غروب آفتاب کے قریب جب فرحت بالائی منزل

کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اور بلقیس اس کا کچھ اٹھائے ادھر ادھر گھوم رہی تھی

عطیہ جھپکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ فرحت نے کرسی سے اٹھ کر کہا: ”آؤ بہن! میں لکھنؤ میں

تمہیں بہت یاد کیا کرتی تھی اور تمہارے بھائی جان بھی بہت یاد کیا کرتے تھے“

”بھابی جان! عطیہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر فرحت سے پلٹتے ہوئے کہا۔

”میں ہر نماز کے بعد یہ دعا کیا کرتی تھی کہ بھائی جان آپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو

جائیں اور پھر جب انہوں نے ماموں جان کو یہ کھا کہ آپ مل گئی ہیں تو میں یہ دعا کیا کرتی

پندرھواں باب

عطیہ دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں گری نیند سو رہی تھی۔ بلقیس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے عطیہ کو بازو سے پکڑ کر جھجھکاتے ہوئے کہا: ”آپا جان! آپا جان! وہ آگئے“

عطیہ نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی: ”کون آگئے؟“

”بھائی معظم علی آئے ہیں آپا جان“

”پھر میں کیا کروں؟ عطیہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھہریے میں آپ کو ایک چیز دکھاتی ہوں۔“

بلقیس اسی طرح بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت

بچہ اٹھائے دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”بھلا بتائیے آپا جان یہ کون ہے؟ اس نے بچے کو عطیہ کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”اسے کہاں سے اٹھا لائی ہو؟“ عطیہ نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

سوال کیا۔

”آپا جان! یہ ان کا بیٹا ہے۔ ان کی بیوی اور ان کی ساس ان کے ساتھ آئی

ہیں۔ وہ نیچے اجی جان اور مائی جان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہیں دیکھیے آپا جان یہ کتنا پیارا

تھی کہ آپ کسی دن یہاں آئیں :

فرحت نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا : "عطیہ تم فرشتہ ہو اور مجھے ہمیشہ تمہاری دعاؤں کی ضرورت رہے گی۔ بیٹھ جاؤ!"

عطیہ اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے غور سے فرحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا : "بھابی جان ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"آپ برا تو نہ مانیں گی؟"

"کبھی نہیں۔"

عطیہ نے اپنی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز قسم لاتے ہوئے کہا : "بھابی جان آپ بہت خوبصورت ہیں۔"

فرحت نے ہنستے ہوئے جواب دیا : "عطیہ بات یہ ہے کہ تم میرے چہرے میں اپنی آنکھوں کا حسن دیکھ رہی ہو؟"



اسی مکان کے مردانہ حصے میں فخر الدین، معظ علی اور اکبر خاں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ ان کے نوکران اور گھوڑوں کی دداری حویلی میں ٹھہرانے کا انتظام کرنے کے بعد وہ معظ علی اور اکبر خاں کے ساتھ دیوان خانے کے ایک کٹہہ کمرے میں داخل ہوا۔ جب وہ ایک دوسرے کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اس نے معظ علی سے مخاطب ہو کر کہا : "بکیے راستے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں، راستے میں ہمیں کوئی قابل ذکر حادثہ پیش نہیں آیا لیکن حیدر آباد سے کوئی آٹھ منزل دور ہمیں یہ پتہ چلا کہ ڈاکو چار دن پہلے ایک چھوٹا سا قافلہ لوٹ چکے ہیں۔ فخر الدین نے کہا : "خدا کا شکر ہے کہ آپ خیریت سے پہنچ گئے لیکن اگر مجھے آپ

کی آمد کی اطلاع ہوتی تو میں حیدر آباد کا سفر دس سے آگے آپ کی حفاظت کا انتظام کر سکتا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اکبر خاں کو بھی ساتھ لے آئے ہیں۔ معظ علی نے کہا : "یہ محض اتفاق تھا کہ جب میں نے سفر کا ارادہ کیا تھا تو یہ میرے پاس آئے ہوئے تھے۔"

"لکھنؤ میں آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے؟"

معظ علی نے جواب دیا : "پانی پت کی جنگ سے واپس آنے کے بعد میں تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکا۔ اب دہلی معولی کا دوبارہ گیا ہے اور وہ میں شیر علی خاں کے سپرد کر آیا ہوں۔ میں کچھ عرصہ سیر و سیاحت سے جی بھلانا چاہتا ہوں۔"

فخر الدین مسکرایا اور قدرے توقف کے بعد بولا : "جس معظ علی کو میں جانتا ہوں وہ سیر و سیاحت کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے۔ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ اپنی خواہش سے یہاں نہیں آئے ہیں۔"

معظ علی نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا : "اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ میری خواہشات کیا ہیں؟"

فخر الدین نے کہا : "لوگ اپنے ممانوں سے ایسی باتیں پوچھنا خلاف تہذیب سمجھتے ہیں لیکن میں آپ کی ہر پریشانی میں حصہ دار بننا اپنا حق سمجھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ میری حلقہ تفتی نہیں کریں گے۔"

معظ علی نے جواب دیا : "میری پریشانیوں میری اپنی پیدا کردہ ہیں اور کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس دنیا میں میرا صحیح مقام کیا ہے۔ لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت میں محسوس کرتا تھا کہ اب ملک کے کسی حصے کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آئے گی۔"

فخر الدین نے کہا : "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی حکومت کے ساتھ آپ کے تعلقات خراب ہو گئے ہیں۔"

معظم علی نے جواب دیا: "آپ شاید اسے بڑی خیال کریں لیکن اس مرتبہ میں نے قید ہونا پسند نہیں کیا۔ پچھلے وقتوں کے حکمران جب اپنے کسی گستاخ عمدہ دار یا مشیر پر ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے تھے تو اس سے یہ کہا کرتے تھے کہ آپ حج کرائیں۔ شجاع الدولہ کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں ایک گستاخ آدمی ہوں اور اس نے مجھے قید خانے کے داروغہ کے حوالے کرنے کی بجائے یہ مشورہ دیا کہ میں میر نظام علی کی خدمت میں حاضر ہو کر قوم کے اجتماعی مفاد کے لیے دکن اور اودھ کے اتحاد کے مکانات معلوم کروں اور میرے خیال میں آج تک اس نے اتنی رعایت کسی اور کے ساتھ نہیں برتی ہوگی۔"

فخر الدین کے استفسار پر معظم علی نے لکھنؤ میں اپنی سرگرمیوں اور شجاع الدولہ کے ساتھ ملاقات کی تفصیلات بیان کر دیں۔ اس کے بعد فخر الدین نے کہا: "جب آپ نے مجھے پانی پت کی جنگ کے واقعات لکھے تھے تو مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ آپ لکھنؤ واپس کیوں آگئے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ایک سپاہی کی حیثیت میں اپنا صحیح مقام تلاش کرنے کے بعد آپ تجارت میں دلچسپی نہیں لے سکیں گے۔ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد آپ دلی میں نجیب الدولہ کے ساتھ رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے تھے۔"

معظم علی نے جواب دیا: "احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد مجھے دلی اور لکھنؤ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ ایک بے جان بادشاہ جس کا کوئی پُرسان حال نہیں، میری آرزو اور انگلوں کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔ کاش احمد شاہ ابدالی دلی کے تخت پر کسی ایسے آدمی کو بٹھا جاتے جس میں اس دور کے طوفانوں کے ساتھ لڑنے کی جرأت اور ہمت ہوتی۔ نجیب الدولہ اپنے تئذ اپنی قابلیت، اپنی جرأت، ہمت اور ذہانت کے باوجود گھاس کے تنکوں سے قوم کا دفاعی حصار تعمیر نہیں کر سکتے۔ دلی کے امراء اور دلی سے باہر سلطنت کے دوسرے عمدہ دار اگر کسی بات سے بے نیاز ہیں تو وہ قوم کا مستقبل ہے۔ وہ مرکز میں کسی ایسی قیادت کا تصور کرنے پر آمادہ نہیں جس کا اشارہ ہر چھوٹے

بڑے کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہو۔ انھیں ایک کٹھ پتلی کی ضرورت تھی اور وہ انھیں مل گئی ہے۔ ان دنوں اس کے تار شجاع الدولہ کے ہاتھ میں ہیں لیکن آگے چل کر یہ معدوم نہیں کرے گا۔ کٹھ پتلی کس کس کے ہاتھ میں کھیلے گی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اپنے ماضی سے سبق حاصل کریں گے لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ دلی پھر ایک بار ان بھیڑیوں کی شکار گاہ بننے والی ہے جو بار بار اسے تاخت و تاراج کر چکے ہیں۔"

شیخ صاحب! میں ایک سپاہی ہوں اور اب زندگی کی اس منزل میں داخل ہو رہا ہوں جب قوی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ہمت عوام کا ساتھ نہیں دیتی۔ تاہم میرے حوصلے سرد نہیں ہوئے۔ کاش میں کسی ایسے شخص کی رفاقت میں جان دے سکتا جس کی نگاہیں میری قوم کے مستقبل سے روشن ہوتیں۔ میرے لیے پانی پت کی جنگ کے بعد اس ملک کے کسی صوبیدار کی فوج میں بڑے سے بڑا عمدہ حاصل کرنا مشکل رہتا لیکن میرے سامنے وہ لوگ تھے جن کی زندگی کا مقصد قوم کی حفاظت کی بجائے قوم پر حکومت کرنا ہے۔ مجھے اگر صرف اپنی ذاتی خوشی اور سلامتی مطلوب ہوتی تو میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ بھی جا سکتا تھا لیکن مجھے اس وطن کی مٹی سے اسلاف کے خون پسینے کی محک آتی ہے۔ میرے اپنے خرم کی بجائی ہوئی راکھ سے زندگی کی چنگاریاں تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس دور کے رجل عظیم کا متلاشی ہوں۔ لکھنؤ سے میں یہ ارادہ لے کر نکلا تھا کہ اگر میں دکن اور اودھ کا اتحاد کر سکا تو یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا لیکن دکن کے حدود میں داخل ہونے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہاں کی فضا لکھنؤ کی نسبت کم مستحق نہیں۔ میر نظام علی کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے اس کے پیش نظر میں ملک و قوم کے لیے اس کی ذات سے کوئی نیک توقع وابستہ نہیں کر سکتا تاہم میں اس سے ملاقات کی ہوشش کروں گا۔"

فخر الدین نے کہا: "میر نظام علی ان دنوں بیمار گئے ہوئے ہیں اور شاید چند ہفتوں تک واپس نہ آئیں۔ ان کی واپسی پر آپ کی ملاقات کا انتظام ہو جانے کا لیکن مجھے

اس ملاقات سے کسی اچھے نتیجے کی توقع نہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ سرنگاپٹم دیکھ لائیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دن یہ شہر آپ کے سفر کی آخری منزل بن جائے۔ میں حیدر علی کی آنکھوں میں قوم کے مستقبل کی امیدوں کی روشنی دیکھ چکا ہوں۔

معظم علی نے کہا: "آپ پہلے بھی حیدر علی کی تعریف کر چکے ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ پانی پت کی جنگ کے بعد مجھے دہلی میں ایک نوجوان ملا تھا اور اس نے بھی مجھے سرنگاپٹم آنے کی دعوت دی تھی۔"

فخر الدین نے کہا: "اس زمانے میں میں نے آپ سے جس حیدر علی کا ذکر کیا تھا وہ اس قدر مشہور تھا۔ ان دنوں میسور کی ریاست بھی ایک بڑی جاگیر کا درجہ رکھتی تھی لیکن آج میسور ایک سلطنت ہے اور مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کے محل تعمیر کرنے والے قہتم آزما اپنے دزیروں اور مشیروں سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ حیدر علی کون ہے؟ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ اس کے باپ دادا کیا کرتے تھے۔۔۔ آج انگریز، مرہٹے اور نظام جن میں سے ہر ایک جنوبی ہندوستان کو اپنی وراثت سمجھتا ہے یہ محسوس کر رہے ہیں کہ قدرت نے ان کے راستے میں ایک ناقابل تیسر پہاڑ کھڑا کر دیا ہے اس کی شہرت حیدر آباد، دہلی، لکھنؤ، مدراس اور کلکتہ سے نکل کر لندن اور پیرس تک پہنچ چکی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ احمد شاہ ابدالی جیسی پرشکوہ شخصیت سے متعارف ہونے کے بعد آپ کو حیدر علی کی شخصیت کس حد تک متاثر کر سکے گی لیکن اس ملک کے حال اور مستقبل کے متعلق اس کے خیالات دہی میں جو آپ کے ہیں۔"

معظم علی نے کہا: "میں لکھنؤ میں بھی اس کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ میں دہلی ضرور جاؤں گا۔ اگر وہ اس تاریک دور میں قوم کا مشعل بردار بن سکتا ہے تو میں اس کے پیچھے چلنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھوں گا۔ سر دست میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ بڑا نامی تو میں آپ کو دہلی سے زیادہ تکلیف دینا

نہیں چاہتا۔ شاید مجھے کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنا پڑے، اس لیے اپنے ایک علاحدہ مکان کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔"

فخر الدین نے جواب دیا: "دیکھیے اگر آپ اس مکان میں اپنے آپ کو ایک اجنبی محسوس کریں تو میں بہتر سمجھوں گا کہ اسے الگ لگا دی جائے۔ اگر آپ حیدر آباد آ کر کہیں اور ٹھہریں تو میرے لیے اس کے سوا اور کیا راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ میں یہاں سے ہجرت کر کے کہیں اور چلا جاؤں۔"

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا: "شیخ صاحب آپ خفا ہو گئے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

فخر الدین نے کہا: "آپ نے بات ہی ایسی کی تھی۔"

فخر الدین کا رہائشی مکان بہت وسیع تھا اس نے اس کی بالائی منزل کا ایک حصہ معظم علی کے سپرد کر دیا اور کمر خاں کو مہمان خانے کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔



چند دن حیدر آباد رہ کر معظم علی کو اس تلخ حقیقت کا زیادہ مشرت کے احساس ہونے لگا کہ مرہٹوں کے خلاف میر نظام علی کی فتوحات کی خبریں سن کر اس نے دکن کے مستقبل سے جو توقعات دلتے کی تھیں وہ محض ایک خواب تھیں۔ دہلی کے تمام تنگنات حیدر آباد میں آپکے تھے اور دکن کے امرار دور زوال کے مغل شہزادوں کی طرح عیش و نشاط کی زندگی بسر کرتے تھے۔ دکن کی بیشتر فوج ان امرار اور جاگیرداروں کے نجی دستوں پر مشتمل تھی جن کا مرکز و فائدہ دلتا رہتا تھا۔ پانی پت کی جنگ کے بعد مرہٹوں کی کمزوری اور انتشار سے فائدہ اٹھا کر میر نظام علی نے دکن کے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے تھے لیکن فوج کی مدد سے صلابت جنگ کو گدھی سے اتارنے کے بعد اندرونی خلفشار کے خطرے نے اسے اپنے بیرونی دشمنوں کے ساتھ سودا بازیوں پر مجبور کر دیا تھا۔ ابن الوقت اور غادر پرت

”خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا۔ آپ حیدر آباد میں کیسے پہنچے اور یہاں کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں؟ میں آپ کو اکثر یاد کرتا تھا۔“

معظم علی نے جواب دیا۔ ”مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ دس دن ہو چکے ہیں اور میں شیخ فخر الدین کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ یہاں کے ایک بہت بڑے تاجر ہیں۔“

اسد خاں نے کہا۔ ”میں انھیں جانتا ہوں۔“

”آپ یہاں کب تشریف لائے تھے؟“ معظم علی نے سوال کیا۔

”میں کوئی تیس دن قبل یہاں آیا تھا لیکن چند دن یہاں رہ کر نظام الملک سے ملاقات کے لیے بیدار چلا گیا تھا۔ پرسوں یہاں واپس پہنچا تھا اور انشاء اللہ یہاں سے سرنگاپٹم روانہ ہو جاؤں گا۔ میں شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں، چلے واپس چل کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔“

معظم علی اس کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں مختصر اپنی سرگزشت سنانے کے بعد اس نے اسد خاں کے بیدار جانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا۔ ”میں نظام کے پاس حیدر علی کی طرف سے دوستی کا پیغام لے کر گیا تھا۔“

معظم علی نے پوچھا۔ ”پھر آپ کی ملاقات کا کیا نتیجہ نکلا؟“

میری ملاقات کا صرف یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اب نظام الملک کے ساتھ آئندہ ملاقاتوں کا راستہ کھل گیا ہے لیکن ذاتی طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرا نظام علی جیسے آدمی سے دوستانہ ملاقاتیں کسی کے لیے سودمند ثابت نہیں ہو سکتیں۔ وہ اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہتا اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ بھنگیے ہونے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں لیکن میسور کے لیے یہ ایک مجبوری ہے کہ نظام کو خوش رکھا جائے اور ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیئے جائیں کہ وہ ہمارے خلاف انگریزوں یا مرہٹوں کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے۔“

امراء کی اکثریت صلابت جنگ کا ساتھ چھوڑ کر حکومت کے نئے دعویدار کی طرف داربن چکی تھی اور جن امراء کی وفاداری مشکوک سمجھی جاتی تھی ان کی جگہ نئے جاگیردار پیدا کیے جا رہے تھے۔ میر نظام علی سے بغاوت کرنے والے چند امراء اور فوجی افسر حیدر آباد سے باہر پناہ لے چکے تھے۔ اس کے دوسرے بھائی بسالت جنگ کو دکن میں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا اور وہ کسی وقت بھی خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ نظام علی نے اسے مطمئن کرنے کے لیے اودھوئی کی حکومت اس کے سپرد کر دی اور دریا سے کرشنا کے جنوب میں چند اضلاع اس کے حوالے کر دیئے۔ بسالت جنگ بظاہر اودھوئی کا خود مختار حکمران تھا لیکن عملاً اس کی سلطنت حیدر آباد کی ایک بڑی جاگیر کا درجہ رکھتی تھی۔

معظم علی بیکار بیٹھنے کا عادی نہ تھا۔ وہ کبھی فخر الدین کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر اکبر خاں کے ساتھ میر کی فیت سے شہر کے باہر نکل جاتا۔ فخر الدین کے دسترخوان پر دونوں وقت شہر کے چند امراء تاجر یا علماء موجود ہوتے۔ ایک دعوت میں معظم علی کی ملاقات شہر کے ایک ایسے رئیس سے ہوئی جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابیں جمع کرنے پر صرف کرتا ہے۔ اس نے اپنے کتب خانے کی چند نایاب کتابوں کا ذکر کیا اور معظم علی اس کا کتب خانہ دیکھنے کے لیے اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس کے بعد یہ کتب خانہ معظم علی کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

ایک دن معظم علی چند گھنٹے اس کتب خانے میں صرف کرنے کے بعد واپس گھر آیا تھا کہ بازار میں کسی نے اچانک اس کا بازو دیکر کر دوک لیا۔ معظم علی نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ اجنبی نے کہا۔ ”میں اس گستاخی کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو میں دلی میں آپ سے مل چکا ہوں۔“

معظم علی چند ثانیے تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا۔ ”ارے آپ اسد خاں ہیں۔“

پرسوں علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے؟



اکبر خاں اپنے کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ معظم علی کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور بولا۔
 ”آپ نے بہت دیر لگائی۔ میں بہت پریشان تھا۔“
 معظم علی نے جواب دیا: ”میں کتب خانے سے نکلا تو راستے میں اچانک اسد خاں سے ملاقات ہو گئی۔ یہ اسد خاں وہی ہے جو ہمیں دلی میں ملا تھا۔ ہم پرسوں اس کے ساتھ سرنگاپٹم جا رہے ہیں۔ تم تیار ہونا؟“
 اکبر خاں نے جواب دیا: ”میں تیار ہوں لیکن میں بہت جلد واپس آنا پڑے گا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”ہم جلد ہی واپس آجائیں گے۔“
 اکبر خاں نے سوال کیا: ”آپ بھابی جان کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟“
 ”نہیں وہ یہیں رہیں گی۔ شیخ فخر الدین کہاں ہیں؟“
 وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”میں ابھی ان سے مل کر آتا ہوں۔“ معظم علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا شیخ فخر الدین کے دفتر میں داخل ہوا۔ شیخ فخر الدین اپنے منشی کو کوئی خط لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے معظم علی کو اپنے قریب بٹھالیا اور منشی کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ”میں تمہیں کچھ دیر بعد بلاؤں گا۔ اس وقت ان سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“
 جب منشی کمرے سے باہر نکل گیا تو شیخ فخر الدین نے معظم علی کی طرف دیکھ کر سوال کیا: ”آپ سارا دن کہاں رہے؟“

معظم علی نے اس کے جواب میں اسد خاں سے اچانک ملاقات کی تفصیلات بیان کر دیں۔ بالآخر جب اس نے سرنگاپٹم جانے کے متعلق اپنا ارادہ ظاہر کیا تو فخر الدین نے کہا۔

معظم علی نے کہا: ”آپ کو یاد ہے کہ جب دلی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے مجھے سرنگاپٹم آنے کی دعوت دی تھی؟“

”ہاں مجھے یاد ہے اور میں اب بھی آپ کو سرنگاپٹم آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر میں کل ہی آپ کو اپنے ساتھ لے جاسکوں تو میں سمجھوں گا کہ میرا یہ سفر بہت کامیاب تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میسور کے حالات دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ کے بہترین خواب وہاں پورے ہو رہے ہیں۔ آج جب کہ لوے لنگڑے، اندھے بہرے اور اپنا بچ لوگ قوم کی سیادت کے دعویدار بنے ہوئے ہیں، میسور کا اولوالعزم حکمران اپنی تلوار کی نوک سے اس ملک کے نقشے پر نئی نئی لکیریں کھینچ رہا ہے۔ جب میں نے دلی کی جامع مسجد میں آپ کی تقریر سنی تھی تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھی بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار حیدر علی کو دیکھ آئیں۔“

معظم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا: ”میرے ساتھ اکبر خاں بھی آیا ہوا ہے۔ وہ دلی میں آپ سے ملا تھا۔ اگر آپ ایک دو دن ٹھہر جائیں تو ممکن ہے ہم دونوں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔“

اسد خاں نے جواب دیا: ”میں ایک دو دن کی بجائے ایک دو ہفتے آپ کے لیے ٹھہر سکتا ہوں۔“

سرکاری جہان خانے میں پہنچ کر معظم علی دیر تک اسد خاں کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر حیدر علی کی شخصیت تھی۔ قریباً دو گھنٹے کے بعد معظم علی نے اٹھ کر کہا: ”اب مجھے اجازت دیجیے۔“

اسد خاں نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: ”تو اس بات کا ذہن ہو چکا ہے کہ آپ میرے ساتھ جا رہے ہیں؟“

”ہاں۔“ معظم علی نے جواب دیا۔ ”اگر خدا کا فضل شامل حال رہا تو ہم انشا اللہ

آپ کا یہ کتنا غلط ہے کہ آپ نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ اسے بلاوجہ یہاں لائے تھے !

معظم علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ مجھے یہ جوڑا ابتداء ہی سے بہت بھلا معلوم ہوا تھا۔ بارہا میرے دل میں خیال آیا کہ آپ کو خطا کھوں لیکن جرات نہ ہوئی اور اب میرا خیال تھا کہ سرنگا پٹم سے واپس آکر یہ مسئلہ آپ کے سامنے پیش کروں گا اور پیش کرنے سے پہلے اپنے گھوڑوں پر زینیں ڈلوادوں گا۔ تاکہ اگر آپ ہمیں فوراً گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت محسوس کریں تو ہمیں پریشانی نہ ہو۔"

فخر الدین نے کہا۔ "میرے دوست میں پتھر اور ہیرے میں تمیز کر سکتا ہوں۔ حقوڑی دیر بعد معظم علی، اکبر خاں کے کمرے میں داخل ہوا۔ اکبر خاں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

معظم علی نے کہا : اکبر خاں گھر سے آئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سرنگا پٹم جلنے کی بجائے آج ہی کھنڈرواد ہو جائیں تم نوکروں کو گھوڑے تیار کرنے کا حکم دو۔ ہم شام سے پہلے پہلے ایک منزل طے کرنا چاہتے ہیں۔

اکبر خاں کے چہرے پر اچانک مایوسی کے بادل چھا گئے۔

معظم علی نے پھر کہا۔ "جاؤ اکبر دیر نہ کرو! میں شیخ فخر الدین سے اجازت لے چکا ہوں !

"لیکن بھائی جان۔۔۔"

"کیا ہے اکبر؟"

"کچھ نہیں بھائی جان! اس نے بددلی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اے شہر دیکھا بات ہے، تم واپس نہیں جانا چاہتے؟"

اکبر خاں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور معظم علی نے ایک تہقیر لگانے کے بعد آگے بڑھ کر

یہ ضروری ہے کہ آپ یا تو اگلے ہینے جائیں یا اس ماہ کے اختتام سے پہلے یہاں واپس آجائیں۔ اگلے ہینے کی تین تاریخ کو عطیہ کی بات آنے والی ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ آپ اور اکبر خاں اس موقع پر موجود ہوں !

"میں ضرور پہنچ جاؤں گا لیکن ان کی ملگنی کہاں ہوئی ہے؟"

"ادھوئی کے ایک جاگیردار کے لڑکے کے ساتھ۔ وہ بسالت جنگ کے رشتے دار

ہیں۔ لڑکے کا نام طاہر بیگ ہے اور وہ ادھوئی کی فوج میں ملازم ہے عطیہ کی شادی پر

آپ کا موجود ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اب بلیقیس بھی بڑی ہو چکی ہے اور میں

ایک ہی دن دونوں بہنوں کی سادی کے امکانات پر غور کر رہا ہوں۔"

"بلیقیس کا رشتہ کہاں طے ہوا ہے؟ معظم علی نے سوال کیا۔

فخر الدین مسکرایا۔ بلیقیس کے لیے میں نے جس نوجوان کا انتخاب کیا ہے۔ اسے آپ

سے زیادہ کوئی نہیں جانتا !

معظم علی نے غور سے فخر الدین کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے کہا : میں جس نوجوان کو

جانتا ہوں اس کا نام اکبر خاں ہے اور اگر آپ نے اسے پسند فرمایا ہے تو میں آپ کے حق

انتخاب کی داد دینے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلیقیس اگر میری سگی بہن ہوتی تو بھی مجھے اس سے

زیادہ خوشی نہ ہوتی۔"

فخر الدین نے کہا : بلیقیس اور عطیہ دونوں آپ کو سگے بھائی سے زیادہ عزیز سمجھتی ہیں۔

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ایک بھائی کا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔

میں ابھی اکبر خاں سے اس کا فیصلہ کرتا ہوں !

فخر الدین نے کہا۔ "اکبر خاں سے فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہمیں صرف ان کے بھائی جان

کی رضامندی کی ضرورت تھی۔ آج صبح جب آپ باہر گئے تھے تو ہمارے گھر میں یہ مسئلہ

پیش ہوا تھا۔ پھر جب میں نے اکبر خاں سے کہا تو اس کا چہرہ کاٹوں تک سرخ ہو گیا تھا اور

اسے گلے لگایا۔

”نالائق تم بہت خوش قسمت ہو۔ بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ شیخ صاحب کے ساتھ تمہاری کیا باتیں ہوئی تھیں؟“

اکبر خاں کا دل دھڑک رہا تھا اور اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا رہی تھی۔

تیسرے دن علی الصباح معظم علی اور اکبر خاں اسد خاں کے ہمراہ مرگاپٹم کا رخ کر رہے تھے :-



ایک روز دوپہر کے وقت معظم علی اور اس کے ساتھی مرگاپٹم میں داخل ہوئے۔ اسد خاں انہیں اپنے مکان پر شہر اکبر حیدر علی کے پاس چلا گیا۔ شام کے وقت اس نے واپس آکر معظم علی کو اطلاع دی کہ نواب حیدر علی کل صبح آپ سے ملاقات کریں گے۔

اگلے دن صبح کی نماز کے تھوڑی دیر بعد معظم علی اور اکبر خاں اپنے میزبان کے ساتھ شاہی محل کی طرف چل دیئے، وہ بائیں باغ میں داخل ہوئے تو اسد خاں نے باغ کے دریاں ایک سائبان کے قریب پہنچ کر کہا :- آپ یہاں تشریف رکھیں۔ اس وقت وہ عام طور پر یہیں ملاقات کیا کرتے ہیں :-

وہ سائبان کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انہیں دو نوکر اور ایک کم سن لڑکا باغ میں بھاگتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے آگے آگے ایک شیر کا بچہ تھا۔ کسن لڑکا نوکروں سے چند قدم پیچھے تھا۔ تھوڑی دور جا کر نوکروں نے شیر کے بچے کو گھیر لیا۔ ایک نوکر اس کے گلے کی زنجیر پکڑنے کے لیے جھکا لیکن اس نے غزا کر اپنے دونوں اگلے پیچھے اٹھائے اور نوکر بدحواس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرے نوکر نے اپنی جگہ سے ہلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کسن لڑکا ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اطمینان سے شیر کے جسم پر ہاتھ پیرنے کے بعد اس کی زنجیر پکڑ لی۔

”اب اسے لے جاؤ“ لڑکے نے نوکر کی طرف زنجیر بڑھاتے ہوئے کہا۔

”حضور یہ کاٹتا ہے۔“

”تم یوں ہی ڈرتے ہو۔ دیکھو!“ لڑکے نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ شیر کے بچے کے منہ کے سامنے کر دیا۔

جب شیر کا بچہ لڑکے کا ہاتھ چلنے کے بعد اس کے پاؤں پر لیٹ گیا تو اس نے فاختہ انداز سے نوکروں کی طرف دیکھا اور کہا :- تم اگر اس سے ڈر دو گے تو یہ خواہ مخواہ کاٹے گا۔

ایک نوکر نے کہا :- ”نہیں حضور اگر ہم نہ ڈریں تو بھی یہ کاٹتا ہے۔“

”یہ کون ہے؟“ معظم علی نے اسد خاں سے سوال کیا۔

”یہ شہزادہ فتح علی ٹیپو ہیں۔ انہیں شیروں کا بہت شوق ہے۔“

معظم علی نے کہا :- ”ایک شہزادے کے لیے شیروں سے بہتر کیا کھلونے ہو سکتے ہیں۔ انہیں بلائیے۔“

اسد خاں نے اٹھ کر آداری شہزادہ صاحب! ادھر تشریف لائیے۔

ٹیپو، شیر کا بچہ نوکروں کے حوالہ کر کے اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا سائبان کی طرف بڑھا۔ معظم علی اور اکبر خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ٹیپو نے ”السلام علیکم“ کہہ کر یکے بعد دیگرے ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور معظم علی اور اکبر خاں کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسد خاں نے کہا :- شہزادہ صاحب! یہ معظم علی خاں ہیں۔ آپ مرشد آباد کے رہنے والے ہیں۔ پلاسی کی جنگ سے پہلے آپ سراج الدولہ کی فوج میں عہدہ دار تھے اور یہ روسی کشید کے سردار اکبر خاں ہیں۔ آپ پانی پت کی جنگ کے متعلق بہت سوالات کیا کرتے ہیں اور یہ دونوں اس جنگ میں حصہ لے چکے ہیں۔

شہزادہ ٹیپو نے کہا :- مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو

کے لیے پیدا ہوا ہے۔

حیدر علی نے کہا: "اسد خاں تھاری میزبانی ختم ہو چکی ہے اور آج سے یہ میرے مہمان ہیں۔" پھر وہ معظم علی کی طرف متوجہ ہوا۔ میں اسد خاں کی زبانی آپ کی سرگذشت سن چکا ہوں اور میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ نے یہاں تک آنے کی تکلیف گوارا کی ہے، اسد خاں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بہت جلد واپس جانا چاہتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کو اس ملک کے مسلمانوں کے لیے کسی مضبوط قلعے کی تلاش ہے تو آپ دوبارہ یہاں آئیں گے۔ جو ٹرپ آپ کو پانی پیت کے میدان میں لے گئی تھی اور جو دلولہ آپ کو حیدر آباد لایا ہے۔ وہ کسی دن آپ کو یہاں آنے پر مجبور کر دے گا۔ کادیری کے پانی کے بغیر آپ کی پیاس نہیں بجھے گی۔ اگر آپ ایک اچھے سپاہی ہیں تو میسور کی فوج میں آپ کی جگہ خالی ہے۔ اگر آپ مدبر اور سیاست دان ہیں تو آپ یہ عرصہ کریں گے کہ آپ کی یہاں ضرورت ہے۔ اگر آپ کو تجارت کا شوق ہے تو میسور میں آپ کے لیے ترقی کے رستے کھلے ہیں اور اگر آپ ایک ہندو یا عالم ہیں تو یہاں آپ کے قدر دان موجود ہیں۔ اسد خاں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے سفر کا مقصد اس ملک کے مسلمان حکمرانوں میں اتحاد اور تعاون کے امکانات معلوم کرنا ہے۔ آپ میری طرف سے ان سب کو یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ جب وہ کسی اجتماعی خطرے کی مداخلت کے لیے متحد ہوں گے تو مجھے سب سے اگلی صف میں پائیں گے۔ میرے نزدیک ہندوستان کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ انگریز ہیں اور جب تک جذب میں ان کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے ہیں چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ میں جنوبی ہندوستان کو انگریزوں کی ہوس ملک گیری سے بچانے کے لیے نظام کی دوستی کا طلبگار ہوں اور اگر مرہٹے پر امن رہے تو میں ان کے ساتھ بھی الجھنا پسند نہیں کروں گا۔

معظم علی نے کہا: "خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے

تو آپ مجھے جنگ کا نقشہ بنادیں۔ پھر میں آپ سے چند سوالات پوچھوں گا۔" ٹیپو کی عمر گیارہ سال سے زیادہ تھی لیکن اس کا چہرہ اس کی عمر کے مقابلے میں بہت سنجیدہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ چمک دار آنکھوں سے غیر معمولی ذہانت مترشح تھی۔ تاہم معظم علی کے نزدیک وہ ایک کم سن بچہ تھا۔

اس نے کہا: "بہت اچھا میں آپ کو نقشہ بنا دوں گا۔" ٹیپو نے کہا: "اگر آپ کو فرصت ہو تو میں ابھی کاغذ قلم منگواتا ہوں۔"

حیدر علی علی کی طرف سے نمودار ہوا اور اسد خاں نے جلدی سے اٹھ کر کہا: "وہ آ رہے ہیں!"

معظم علی اور اکبر خاں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

شہزادہ ٹیپو نے کہا: "آپ ابا جان سے ملاقات کے بعد کہیں غائب نہ ہو جائیں۔" اسد خاں نے کہا: "شہزادہ صاحب آپ مطمئن رہیں۔ یہ میرے مہمان ہیں اور جب تک یہ نقشہ نہیں بنائیں گے میں انھیں کہیں غائب نہیں ہونے دوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد حیدر علی سائبان میں داخل ہوا اور اسد خاں اور اس کے ساتھیوں سے مصافحہ کرنے کے بعد بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ معظم علی ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

جی ہاں۔

"اور آپ اکبر خاں ہیں؟"

جی ہاں۔ اکبر خاں نے جواب دیا۔

معظم علی اور اکبر خاں کی نگاہیں رعب و جلال کے اس بیکہ مجسم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ حیدر علی کی آنکھیں اور اس کے چہرے کے خند خال یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کم دینے

گا لیکن جتنے دن آپ یہاں ہیں، میں آپ کی موجودگی سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔
اب انشاء اللہ شام کے وقت ملاقات ہوگی۔

سانہان سے تھوڑی دور محل کے دروازے کے سامنے چند سپاہی اور افسر گھوڑوں
کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ حیدر علی نے معظم علی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد کبر خاں
سے ملے ملایا اور شہزادہ ٹیپو کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "اؤ فوج علی!"

ٹیپو نے کہا: "ابا جان مجھے ان سے ایک کام ہے۔ میں تھوڑی دیر تک پہنچ
جاؤں گا۔"

حیدر علی نے جواب طلب نگاہوں سے اسد خاں کی طرف دیکھا اور اس نے کہا:
"عالی جاہ! شہزادہ ٹیپو ان سے پانی پت کے میدان کا نقشہ بنوانا چاہتے ہیں۔"

حیدر علی نے مسکرا کر معظم علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ
یہاں آپ کی ضرورت ہے؟"

تھوڑی دیر بعد حیدر علی گھوڑے پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل گیا اور معظم
اکبر خاں، اسد خاں اور شہزادہ فتح علی ٹیپو کے ساتھ شاہی مہمان خانے میں داخل ہوا۔ شہزادہ
ٹیپو کے حکم سے ایک سپاہی کاغذ اور قلم لے آیا اور معظم علی قائلین پر بیٹھ کر نقشہ بنانے میں
مصرف ہو گیا۔ معظم علی کا خیال تھا کہ ایک کسٹ کے کوٹھن کرنے میں اسے زیادہ وقت
نہیں ملے گا لیکن شہزادہ ٹیپو کے غیر متوقع سوالات کے جواب میں اسے میدان جنگ کی
تمام تفصیلات اور جزئیات پر متوجہ کرنا پڑا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد کاغذ ان ہستیاں نشانہات
اور کیوں سے بھر چکا تھا۔ جن سے فریقین کے پڑاؤ، ان کے رستہ اور ملک کے راستوں
ان کی افواج کی صفوں اور ان کے توپخانوں اور مختلف معرکوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔

نقشہ ختم کرنے کے بعد معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پانی پت کی جنگ کی پوری
تاریخ بیان کر چکا ہے۔ جب کہ شہزادہ نقشہ لے کر معظم علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد

کر نظام انگریزوں کے خلاف آپ کا ساتھ دینے کی بجائے انگریزوں کی مدد سے سیور پر
قبضہ جانے کی کوشش کرے گا اور مرہٹے بھی آپ کی بیٹھ میں چھرا گھونپنے کا کوئی موقع ملا
سے نہیں جانے دیں گے۔ پانی پت کی شکست کے بعد وہ جنوبی ہند میں ایک طاقتور مسلم
حکمران کا عروج برداشت نہیں کریں گے۔ آپ کو بیک وقت ان تین طاقتوں کے خلاف
جنگ لڑنی پڑے گی اور مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ اودھ اور دق کے مغلوں اور بے بس
امرا آپ کو کوئی مدد دے سکیں گے۔ میرا مقصد آپ کی حوصلہ شکنی نہیں، لیکن بنگال کے
واقعات نے مجھے بہت زیادہ حقیقت پسند بنا دیا ہے۔"

حیدر علی مسکرایا: "ایک حقیقت پسند آدمی کی گفتگو میری حوصلہ شکنی یا دلا زاری کا باعث
نہیں ہو سکتی۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دن مجھے تمہارا ان بیٹوں اور گیدڑوں کی افواج کے سامنے
سینہ سپر ہونا پڑے گا لیکن مجھے خدا کی اعانت پر بھروسہ ہے، اگر مجھے کام کرنے کی مہلت مل
گئی تو میں سیور کی سرزمین کو ایک ناقابل تخیل قلعے میں تبدیل کر دوں گا۔ میں وہ فوج تیار
کروں گا، جو ہر میدان میں ان حریف طالع آزمائوں کے دانت کھٹے کر سکے گی۔ میرے بھندے
تھے کرائے کے سپاہی نہیں ہوں گے بلکہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں اس وطن کی خاک اپنی جاؤں
سے زیادہ عزیز ہوگی۔ جب تک میرے ہاتھ توار اٹھا سکیں گے میں لڑتا رہوں گا اور آپ
جیسے لوگ حیدر آباد، دق کے مسلمانوں کو یہ بتا سکیں گے کہ سیور کی جنگ تمہاری
بہادر تھاری عزت اور آزادی کی جنگ ہے۔"

حیدر علی گفتگو کے دوران میں معظم علی یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ برسوں بے آب و گیاہ
صحراؤں میں گھومنے کے بعد اپنے سینوں کی فادی میں پہنچ گیا ہے اس کا دل حیدر علی کے
یہ معتبر اور محبت کے جذبات سے ہرگز ہٹا۔ اس نے کہا: "مجھے یہاں آنے کا فیصلہ
کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں ابھی بے کادری کے پانی کی مٹھاس محسوس کر رہا ہوں۔"

حیدر علی نے ہاتھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "میں آپ کا انتظار کر رہا

وہاں سے چلا گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، خدا اس لڑکے کو نظر بد سے بچائے۔ بعض اوقات اس کے سوالات سے مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے سپر سالار سے باتیں کر رہا ہوں۔ شہزادہ کی عمر کتنی ہے؟

اسد خاں نے جواب دیا: "ان کی عمر بارہ سال سے کم ہے لیکن حیدر علی کے بیٹے کے مزے ایسی باتیں عجیب معلوم نہیں ہوتی جاسہیں۔ قدرت نے اسے ایک غیر معمولی ذہانت عطا کی ہے۔ کل اگر آپ اس کا امتحان لیں تو یہ نقشہ اسے اپنے ہاتھ کی لکڑیوں کی طرح یاد ہوگا۔"

معظم علی نے کہا: "پہلے میرا خیال تھا کہ بچے کو بھلانے کے لیے چند الٹی میڈیا لکیریں کیسٹنگ دوں گا لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ غلطی نہیں کی۔ اس لڑکے سے باتیں کرنے کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دن میرے جیسے ہزاروں انسان اس کی رفاقت میں جینا اور مرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھیں گے۔ اسد خاں، تم درست کہتے تھے۔ مجھے بہت جلد دوبارہ یہاں آنا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ میں حیدر آباد سے لکھنؤ جانے کا خیال ترک کر دوں۔"

اگلی صبح اسد خاں، معظم علی اور کبر خاں کو شہر میں اسلحہ سازی کا کارخانہ دکھانے کے لیے لے گیا جہاں تواری، بندوقیں اور توپیں بنائی جا رہی تھیں۔ بندوقوں کے کارخانے کی گزائی ایک فرانسیسی ماہر کے سپرد تھی۔ کارخانے کے منظم نے معظم علی کو چند بندوقیں دکھانے کے بعد کہا: "یہ بندوقیں دلایت کی بہترین بندوقوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہم اگلے سال تک توپیں بنانے کا کام بھی شروع کر دیں گے۔"

اسلحہ سازی کا کارخانہ دیکھنے کے بعد اسد خاں اپنے مہمانوں کو فوجی مستقر میں لے گیا جہاں ہزاروں سپاہی پریڈ کرنے اور دفاعی مورچے تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ وسیع میدان میں کہیں نیزہ بازی اور کہیں چاند ماری ہو رہی تھی۔ حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو گھوڑوں

پر سوار ہو کر مختلف فوجی کھیلوں میں حصہ لینے والے سپاہیوں کی کارگزاری دیکھ رہے تھے۔ اسد خاں نے معظم علی سے کہا: "اگر آپ میسور کا دورہ کریں تو آپ کو یہاں کے ہر شہر میں اسی طرح کا جوش اور ولولہ دکھائی دے گا۔ حیدر علی ملک کے ہر باشندے کو سپاہی بنانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔"

معظم علی نے سوال کیا: "انہوں نے شہزادہ ٹیپو کی تعلیم کا کیا انتظام کیا ہے؟" اسد خاں نے جواب دیا: "حیدر علی کے سامنے اہم ترین مسئلہ ٹیپو کی تعلیم ہے۔ ٹیپو کے استاد اپنے وقت کے بہترین عالم ہیں۔ نواب حیدر علی یہ کہہ کرتے ہیں کہ قدرت نے میرے ہاتھ میں صرف توار دی ہے لیکن میرے بیٹے کے ہاتھ میں نغم بھی ہوگا۔ ٹیپو کی ذہانت کا یہ عالم ہے کہ انہیں ایک سبق دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی؟"



فرحت کی ماں اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئی ہوئی تھی اور فرحت اپنے کمرے میں بیٹھی عطیہ سے باتیں کر رہی تھی۔ ننھا صدیق علی ایک جھولے میں سو رہا تھا۔ بقیس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا: "بھابی جان! بھابی جان! بھابی جان! آگئے!"

فرحت کا چہرہ غشی سے ممتا اٹھا۔ عطیہ نے ایک شرارت آمیز قسم کے ساتھ بقیس کی طرف دیکھا اور کہا: "بقیس تم اتنی بدحواس کیوں ہو۔ بھابی جان کے ساتھ تھکا دو لہا میاں بھی آتے ہیں یا نہیں؟"

بقیس پریشانی کی حالت میں یہ فیصلہ کر سکی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ فرحت نے مسکرا کر کہا: "عطیہ دیکھو میری بہن کو مت چھیڑو۔ آؤ بقیس بیٹھنا تو!"

بقیس آگے بڑھ کر فرحت کے قریب بیٹھ گئی۔ عطیہ نے اسے دبا کہا: "بھابی جان سچ کہتی ہوں بقیس کئی دن سے پریشان تھی اور آج صبح

ہونے دیا کہ اس کی بیٹیاں میہم ہیں۔ اس نے دونوں لڑکیوں کو بیش قیمت زیورات کے علاوہ دودھ بھی اور تیس تیس گھوڑے جہیز میں دیئے۔

عطیہ کا شوہر ایک خوش وضع نوجوان تھا اور معظم علی اس کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہو چکا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے معظم علی کو بڑے اصرار کے ساتھ ادھونی آنے کی دعوت دی۔ عطیہ کی سواری کو رخصت کرنے کے بعد معظم علی جاننا کے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں اکبر خاں شادی کے لباس میں بیٹھا ہوا تھا۔

”کیوں بھی کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے کہا۔

”کچھ نہیں بھائی جان“ اکبر خاں نے جواب دیا۔ ”مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ میری زوجہ سے شیخ فخر الدین کی بچی ہوئی ہوگی۔ حیدر آباد کے امیر میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوں گے۔ میں رسومات کا قائل نہیں لیکن شیخ فخر الدین کی خاطر میں روہیلکھنڈ سے برات کے ساتھ آنا چاہیئے تھا۔“

معظم علی نے کہا: ”ارے میں سمجھا تھا کہ تم پانی پت کی جنگ کے متعلق سوچ رہے ہو۔ شیخ فخر الدین تم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ اگر وہ دکھاوے کی ضرورت محسوس کرتے تو اسی شہر سے دس ہزار آدمی تمہاری برات میں جمع ہو سکتے تھے۔ تم بہت خوش قسمت ہو اکبر! میں نے تمہارے سیلے اس لڑکی کو اس دن منتخب کیا تھا۔ جب حیدر آباد کے راستے میں ان لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ شیخ فخر الدین تمہیں کم از کم ایک ہفتہ اور یہاں ٹھہرا کر پر مصر ہیں اور اتنے دن مجھے بھی یہاں رکنا پڑے گا۔ اس کے بعد تمہاری منزل روہیلکھنڈ ہوگی اور میرا رخ سرنگاپٹم کی طرف ہوگا۔ میں لکھنؤ جانے کا خیال ترک کر چکا ہوں۔ دہلی میری جائداد میں شیر علی اور تم برابر کے حصہ دار ہو۔ میں نے انہیں یہ لکھ دیا ہے کہ آئندہ وہ تجارت میں میرے حصے کا منافع تمہیں بھیجتے رہیں۔ آج تمہاری سیر و سیاحت کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔ شادی کے بعد تمہیں اپنے گھر پہنچ کر نئی نئی ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔“

ہی بدحواس تھی۔“

بلقیس اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سر ہلایا احتجاج بن کر بولی۔ ”بھائی جان! آپا مجھے تنگ کرتی ہیں!“

”نہ بھی عطیہ میری سخی بہن کو تنگ نہ کر دو۔“

عطیہ نے کہا: ”بھائی جان یہ بالکل مصنوعی غصہ ہے۔ ہم پر خواہ مخواہ رعب ڈالا جا رہا ہے۔ درزیہ دل میں ہنس رہی ہے۔“

فرخت نے کہا: ”ہاں بھی تم سچ کہتی ہو یہ تو واقعی ہنس رہی ہے۔“

بلقیس تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے باہر نکل گئی لیکن دروازے کے باہر پہنچ کر وہ اچانک رکی اور مڑ کر کمرے کی طرف جھانکتے ہوئے بولی۔ ”بھائی جان! بھائی جان! وہ ادھر آ رہے ہیں۔“

عطیہ بدحواس ہو کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

جب وہ برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو بلقیس نے پیچھے سے اچانک تہقیر لگاتے ہوئے کہا: ”ٹھہریے آپا جان آپ کیوں بھاگ رہی ہیں وہ تو ماںوں جان کے دفتر میں گئے ہیں۔“

”بڑی چڑیل ہو تم! عطیہ نے مڑ کر کہا۔“

چند دن بعد اسی مکان کے پچھلے حصے کے ایک کمرے میں عطیہ اور بلقیس دھنوں کے لباس اور قیمتی زیورات پہنے بیٹھیں۔ عطیہ کی برات دودن شیخ فخر الدین کے یہاں میام کرنے کے بعد واپس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فرخت دھنوں کے گرد جمع ہونے والی عورتوں کو ادھر ادھر بٹائی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے عطیہ اور بلقیس کے گلوں میں کیے بعد کے موتیوں کا ایک ایک مار ڈالتے ہوئے کہا: ”یہ تمہارے بھائی جان کا تحفہ ہے۔“

عطیہ کی برات بڑی دھوم دھام سے آئی تھی۔ فخر الدین نے اپنی بہن کو یہ احساس نہ

دو خداؤں کے ساتھ ایک۔ پہلی میں سوار تھی۔ جہیز کے ہاتھیوں، گھوڑوں اور دوسرے ساز و سامان کی حفاظت کے لیے فخر الدین نے قافلے کو ناکافی سمجھ کر ان کے ساتھ اپنے چاکر مسلح نوکر روانہ کر دیئے تھے۔ اکبر خاں شہر سے باہر نکلتے ہی معظم علی بے رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن معظم علی کچھ دور اس کا ساتھ دینے پر مصر تھا۔ شہر سے ایک کوس دور آنے کے بعد اکبر خاں نے کہا: ”بھائی جان! آپ بہت دور آگئے ہیں۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”نہیں اکبر خاں میں کچھ دور اور تھا رہے ساتھ چلوں گا۔“ کچھ فاصلہ اور طے کرنے کے بعد اکبر خاں نے پھر ایک بار خدا حافظ کہنے کی کوشش کی لیکن معظم علی نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ قافلے نے ایک بستی سے باہر پڑاؤ ڈالا۔ نوکروں نے بلیقے کا خیر نصیب کر دیا۔ عشاء کی نماز کے بعد بقیس اپنے نیچے میں سو رہی تھی اور معظم علی اور اکبر خاں تھوڑی دیر کھلی ہو میں ایک چٹائی پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اگلے دن صبح کی نماز کے بعد جب قافلہ دوبارہ روانہ ہونے لگا تو اکبر خاں نے کہا: ”بھائی جان! آپ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے اب آپ اس سے آگے نہیں جائیں گے۔ دروازہ آپ کو روکھینڈے ہیں ہمارا ساتھ دینا پڑے گا۔“

معظم علی نے جواب دیا: ”نہیں، اب میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔ اب تم اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور دیکھو میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا۔“

— خدا حافظ! — معظم علی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اکبر خاں مصافحہ کرنے کی بجائے بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گیا اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: ”بھائی جان! آج تو میں آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھ رہا ہوں۔“

”جاؤ، نالائق! معظم علی کی آواز اس کے حلق میں بیٹھ گئی۔

اکبر خاں کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا اور

اکبر خاں نے ابدیہ ہو کر کہا: ”بھائی جان یہ بات میرے دہم دگن میں بھی نہ تھی کہ ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ مجھے آپ کی جائزاد کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن آپ کی رفاقت سے محروم ہونا میرے لیے ناقابل برداشت ہو گا۔ اگر آپ نہ چاہتے جانا ضروری سمجھتے ہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ دروازہ ہیکھنڈ میں میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ آپ دلاں کیوں نہیں چلتے ہیں آپ کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دوں گا کہ آپ دلاں ایک اجنبی ہیں۔“

معظم علی نے شفقت سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا: ”اکبر میں اپنی منزل دیکھ چکا ہوں۔ میں کسی جلتے پناہ کی تلاش میں نہیں ہوں۔ بلکہ مجھے صرف اپنے فرائض کا احساس سرنگا پٹ لے جا رہا ہے۔“

”تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“

”نہیں اکبر! تمہارے فرائض تمہیں روکھینڈے جا رہے ہیں۔ تم میری طرح تنہا نہیں ہو۔ تم ایک قبیلے کے سردار ہو اور ان لوگوں کے تم پر کچھ حقوق ہیں۔ میرے ساتھ رہ کر تم نے جو تجربات حاصل کیے ہیں وہ تمہاری رہنمائی کریں گے۔ میں تمہیں روکھینڈے کا بہترین سردار دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی دلاں جاؤں تو تمہارے قبیلے کے ہر فرد کے چہرے پر مسرت کی مسکراہٹیں دیکھوں۔ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ تم روکھینڈے کے مسلمانوں کی آزادی کے پاسان بنو اور تمہارے بعد تمہارے بیٹے یا پوتے اپنے وطن کی آزادی کا پرچم بلند رکھیں۔“

اگلے ہفتے یہاں سے ایک قافلہ گھنٹہ جا رہا ہے۔ شیخ فخر الدین کی خواہش ہے کہ تم اس قافلے کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ پہلے وہ تمہیں یہاں رکھنے پر مصر تھے لیکن میرے ساتھ بحث کرنے کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تمہیں اپنے گھر جانا چاہیے۔“

شادی سے دس دن بعد اکبر خاں، حیدر آباد سے گھنٹہ کا رخ کر رہا تھا۔ بلیقے اپنی

سولھواں باب

سرنگا پٹم میں حیدر علی کی رفاقت کے ایام معظم علی کے لیے قدرت کا بہترین انعام تھا۔ میسور کی سرزمین اس کے خوابوں کی جنت تھی اور زندگی کی کوئی خوشی ایسی نہ تھی جو اسے میسر نہ تھی۔ وہ ایک ایسے قافلے کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھ چکا تھا جس کے مسافروں کے دل ذوق یقین سے لبریز تھے۔ وہ اپنی منزل مقصود دیکھ چکا تھا اور اسے اپنے راستے کے نشیب و فراز کے متعلق کوئی پریشانی نہ تھی۔ اسے زندہ رہنے کے لیے ایک مقصد کی ضرورت تھی اور سرنگا پٹم میں آباد ہونے کے بعد وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی کا ہر سانس ایک مقصد کے لیے وقف ہے۔ اس نے حیدر علی کی فوج کے پانچ سو افراد کے کمانڈر کی حیثیت سے سرنگا پٹم میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور پانچ سال کے عرصہ میں اپنی محنت، قابلیت اور فرض شناسی کی بدولت سرنگا پٹم کی محفوظ فوج کے تین ہزار جوانوں کا سالارِ اعلیٰ بن گیا۔ نظم و ضبط اور مستعدی کے لحاظ سے اس سے تربیت حاصل کرنے والے سپاہیوں کو حیدر علی کی فوج میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ سرنگا پٹم پہنچنے کے پہلے اور تیسرے سال اس کے ہاں دولہا کے اور پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام مسعود علی اور دوسرے کا نام انور علی رکھا گیا۔ اکبر خاں کے ساتھ کچھ عرصہ اس کی خط و کتابت جاری رہی لیکن آہستہ آہستہ نامہ و پیام کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ان تھک مصروفیت کے باوجود اسے فرحت کی رفاقت میں زندگی کے ماہ و سال

گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ قافلہ چند قدم آگے جا چکا تھا۔ اکبر خاں نے گھوڑے کو ایڑ لگانے سے پہلے ایک ثانیہ کے لیے مرکز معظم علی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے اپنے دل میں کہا: خدا حافظ! میرے رفیق، میرے دوست، میرے بھائی، میرے باپ، خدا حافظ!

معظم علی کچھ دیر اپنے گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا رہا۔ پھر اس نے رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے کی باگ موڑ لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹیلے پر گھوڑا روک کر درختوں میں ردپوش ہوتے ہوئے قافلے کی آخری جھلک دیکھ رہا تھا۔

تیسرے دن معظم علی ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ میسور کا رخ کر رہا تھا۔

ایک خواب معلوم ہوتے تھے۔ اس کا مکان سرنگاپٹم کے چند بہترین مکانات میں سے ایک تھا۔ میسر کی فوج کے بڑے بڑے آزمودہ کار جرنیل اور انفراسے اپنا دوست اور رفیق سمجھتے تھے۔ حیدر علی اہم ترین قومی اور سیاسی معاملات میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا اور وہ کس شہزادہ شیو جس کی روشنی پیشانی پر ایک قوم کی تقدیر لکھی ہوئی تھی، اپنی فرصت کے لمحات اس کی صحبت میں بسر کیا کرتا تھا۔ معظم علی اپنی رفیقہ حیات سے اکثر یہ کہا کرتا تھا: فرحت! مجھے قدرت سے اب صرف ایک لاکھ ہے اور وہ یہ کہ جب مجھ میں دشوار گزار راستوں پر چلنے کی ہمت تھی تو میرے سامنے تاریکیاں تھیں اور جب میں صبح کی روشنی میں اپنی منزل دیکھ رہا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے پاؤں زیادہ دیر میرا بوجھ نہیں سہا سکیں گے۔ کاش میں اس ماہی کو واپس لاسکتا جس کی ہر آن زندگی کی دھڑکنوں سے لبریز تھی۔ صدیق، مسعود اور انور خوش نصیب ہیں۔ جب یہ بڑے ہوں گے تو ان کا قاتل سالار فتح علی خاں شیو ہوگا۔

جن ایام میں سلطنتِ خداداد میں حوصلوں اور دلوں کی ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔ ہندوستان کے باقی حصوں میں آئے دن نئے نئے انقلاب آرہے تھے۔

بنگلہ کا نام ہندو حکمران میر قاسم، جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے میر جعفر کی جگہ گدڑی پر بٹھایا تھا۔ ۱۷۷۳ء تک اپنے انگریز سرپرستوں کو اپنی رعایا کا خون ہٹا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بنگال کے عوام روٹی تک کے محتاج ہو چکے تھے لیکن انگریزوں کے مطالبات بڑھتے گئے اور میر قاسم کو اپنا خزانہ خالی کرنے، اپنی بیگمات کا زیور بیچنے۔

ملک کے تاجروں اور زمینداروں کو لوٹنے کے بعد اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے پاس ایسٹ انڈیا کمپنی کی بھوک کا کوئی علاج نہیں ہے۔

انگریزوں نے اس سے بنگال کی حکومت کی گدڑی چھین کر دوبارہ میر جعفر کے حوالہ کر دی میر قاسم نے بنگال سے بھاگ کر اودھ میں پناہ لی۔ نواب وزیر اودھ اور منٹن شہنشاہ بنگال

جوان دہلی الہ آباد میں اپنی بچاؤ کی کوششوں میں مصروف تھا۔ میر قاسم کو مدد دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ۱۷۷۳ء میں کسبکری جنگ میں انھیں شکست ہوئی۔ میر قاسم نے ڈار جوکر جان بچائی اور شہنشاہ جسے ابھی تک دلی کے تخت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی سے جا ملا۔ انگریزوں کی فوج نے لکھنؤ کا رخ کیا اور شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کو مجبوراً انگریزوں سے صلح کرنی پڑی۔ انگریزوں نے نواب وزیر اودھ سے پچاس لاکھ روپیہ تادان جنگ وصول کیا اور الہ آباد اور کرہ کے اضلاع چھین کر شاہ عالم کے حوالے کر دیئے۔ الہ آباد کا قلعہ بھی انھوں نے شہنشاہ کے لیے خالی کر دیا۔ اور اس کی حفاظت پر انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ متعین کر دیا۔ بالفاظ دیگر دلی کا برائے نام شہنشاہ الہ آباد میں انگریزوں کا دست نگر اور وظیفہ خواہ بن گیا اور اودھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں کے دروازے کھل گئے۔

۱۷۷۵ء میں میر جعفر نے وفات پائی اور انگریزوں نے اس کے پندرہ سالہ بیٹے نجم الدولہ کو بیس لاکھ روپیہ بطور نذرانہ اور اس کے علاوہ پانچ لاکھ روپیہ سالانہ بطور خرچ پیش کرنے کی شرط پر بنگال کی گدڑی پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوٹ کھسوٹ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

شمال میں احمد شاہ ابدالی اور اس کے گورنروں کی سرگرمیاں اب زیادہ تر سکھوں کی بغاوتوں کو فرو کرنے تک محدود تھیں اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے علاوہ چارمٹل لاہور، جالندھر، دواپ، سرسہ اور ملتان کے علاقے سکھوں کے ہاتھوں بار بار تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ احمد شاہ ابدالی، فیروز خان بلوچ اور نجیب الدولہ کی افواج انھیں کئی میدانوں میں عبرت ناک شکستیں دے چکی تھیں لیکن جنتی سے ان شاندار فتوحات کے باوجود سکھوں پر دائمی غلبہ رکھنے کے لیے پنجاب میں مستقل طور پر کوئی بڑی فوج موجود نہ رہی۔ جب احمد شاہ ابدالی کا شکر پیش قدمی کرتا تو سکھ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے لیکن ان کی دایمی

کے ساتھ ہی وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ قتل و غارت شروع کر دیتے۔

جنوب میں مرہٹے دوبارہ سراٹھا رہے تھے۔ انھوں نے پانی پت کی جنگ میں جو زخم کھاتے تھے۔ وہ مندمل ہو رہے تھے لیکن ان کی توجہ شمال کی بجائے جنوب کی طرف تھی، یہاں نظام اندا گریز ان کے حریف تھے لیکن یہ تینوں طاقتیں اب ایک دوسرے سے نظریں ہٹا کر حیدر علی کی توجہ متوجہ ہو چکی تھیں میسور کی خوشحالی اور ترقی اور میسور کے حکمران کی شخصیت ان سب کی آنکھ کا سوراخ بن چکی تھی۔ حیدر علی کی طاقت کچل کر میسور کی بندر بانٹ کرنے کے لیے مساعروں میں ان گڑھوں، پھیرلیوں اور گیدڑوں کے درمیان سمجھوتہ ہوا۔ میر نظام علی نے اپنے انگریز اور مرہٹہ حلیفوں کے ساتھ حملے کی تفصیلات طے کرنے کے بعد بنگلور کی طرف پیش قدمی کی اور وہاں سے کوئی تیس میل دور چھینا پٹنا کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے۔

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میر نظام علی کے دیسج خیمے میں محفل رقص و سرور کا راستہ تھی۔ دندار اور فوج کے بڑے بڑے افسر اس کے دائیں بائیں رونق فزا تھے۔ ایک فوجی افسر خیمے میں داخل ہوا اور اس نے کورنش بولنے کے بعد کہا۔

”حضور! انگریز فوج کا ایک کپتان اسی وقت باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔“

نظام نے جواب دینے کی بجائے قہر کو دنگا ہوں سے اپنے سپہ سالار تہوڑ جنگ کی طرف دیکھا اور وہ قدرے توقف کے بعد اٹھ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔

نظام علی نے مشیر الملک کی طرف دیکھتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا۔ ”یہ لوگ ایسی بارش میں بھی آرام نہیں کرتے۔ میں انہیں بار بار یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ موسم جنگ کے لیے موزوں نہیں۔“

مشیر الملک نے جواب دیا۔ ”لیکن حضور! مدراس کے گورنر کا یہ خیال تھا کہ برسات کا موسم شروع ہونے سے پہلے ہمیں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لینا چاہیے۔ اگر مرہٹوں کی طرف سے تاخیر نہ ہوتی تو اس وقت تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔“

نظام نے جواب دیا۔ ”مرہٹے ہماری نسبت زیادہ ہوشیار ہیں۔ وہ اس وقت تک میدان میں نہیں آئیں گے جب تک کہ اُدھی جنگ ختم نہیں ہو جاتی۔“

نظام کے محافظ دستوں کے سالار اعلیٰ شمس الامراء نے کہا۔ ”حضور! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مزید ہوشیاری کا ثبوت دیں اور جنگ میں شریک ہی نہ ہوں۔“

مشیر الملک نے برہم ہو کر کہا۔ ”آپ کو حضور نظام کے اتحادیوں کے متعلق ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

شمس الامراء نے جواب دیا۔ ”معاف کیجیے، میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ حضور نظام کی وفاداری میں کوئی مجھ سے آگے ہے لیکن جب تک مرہٹے میدان میں نہیں آجاتے میں ان کی نیک نیتی کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

مشیر الملک کی توقع کے خلاف نظام نے شمس الامراء کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”تم درست کہتے ہو۔ ہم نے مرہٹوں کے متعلق اطمینان کے بغیر پیش قدمی کرنے میں غلطی کی ہے۔“

شمس الامراء نے مشیر الملک کی طرف ایک فاختہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”حضور! میں شروع سے ہی اس پیش قدمی کے خلاف تھا۔ خدا معلوم اگر مرہٹوں کی فوری اعانت کے بعد وہ سے پر بنگلور پر حملہ کر دیتے تو اس وقت ہماری کیا حالت ہوتی؟“

تہوڑ جنگ دوبارہ خیمے میں داخل ہوا اور اس نے نظام کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔ ”اچھی، مدراس کے گورنر کی طرف سے کوئی اہم پیغام لایا ہے اور وہ اسی وقت ترمسوی کی اجازت چاہتا ہے۔“

بہت اچھا۔ یہ فعل برخواست ہوتی ہے۔ بلاؤ اسے۔

نظام کے اشارے سے رفاصلیں اور سازندے خیمے کے دوسرے دروازے سے نکل کر ساتھ والے خیمے میں چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد ایک انگریز انفریجے میں داخل ہوا۔ اس نے فوجی طریقے سے سلام کرنے کے بعد ایک تھیلہ جو اس کی کمر سے لٹک رہا تھا، کھولا اور ایک مراسلہ نکال کر نظام کو پیش کر دیا۔ نظام نے مراسلہ پڑھ کر منیر الملوک کو دے دیا۔

انگریز انفرنے کہا: یورہائیں مجھے کرنل اسمتھ کا حکم ہے کہ میں کسی تاخیر کے بغیر اس خط کا جواب لے کر پہنچ جاؤں۔

نظام نے جواب دیا: ہم کرنل اسمتھ کو کچھ چکے ہیں کہ مرہٹوں کی طرف سے اطمینان کیے بغیر ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

انگریز انفرنے کہا: ہنریکسینی گورنر اس اس مکتوب میں آپ کو یہ یقین دلا چکے ہیں کہ مرہٹے، سرنگ پٹم کی طرف آپ کی پیشقدمی کی اطلاع پاتے ہی میدان میں آجائیں گے۔ ان کی فوج کا ایک حصہ آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا اور دوسرا ملیار میں ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔

نظام نے کہا: لیکن اگر بادش کا یہی حال رہا تو آپ کی کوئی تجویز ہمارے لیے قابل عمل نہیں ہوگی۔ ایسا موسم صرف حیدر علی کی پیڑاہ فوج کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اب تک ہم نے اسلحہ، بارود اور رسد کا جو سامان یہاں جمع کرنے کی کوششیں کی ہیں اس میں سے نصف دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے، اس وقت ہماری جتنی فوج اس پڑاؤ میں ہے قریباً اتنی ہی رسد و ملک کے راستوں میں پہرہ دے رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہماری رسد و ملک کا کوئی دوسرا صمیم سلامت یہاں نہیں پہنچا۔ اگر مرہٹے معاہدے کے مطابق ہمارا ساتھ دیتے تو ہمیں اس پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس پانی اور کچڑ میں

اگر پیشقدمی شروع کر دیں تو ہمیں دنوں کے سفر کے لیے ہفتے درکار ہوں۔ ہمارے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دشمن کے چھاپہ مار دے تے ہوں گے۔ انگریز انفرنے کہا: معاف کیجیے آپ کو دشمن کی طاقت کے غلط اندازے نے پریشان کر دیا ہے۔ ہماری فوج ملیار کی طرف پیشقدمی شروع کر چکی ہے اور بادش دہاں بھی ہو رہی ہے لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ موسم کی خرابی کے باعث ہماری اور ہمارے دشمن کی مشکلات ایک جیسی ہیں۔

نظام نے جواب دیا: ملیار کے ساحلی علاقے پر آپ کا سلاط آپ کا بحری بیڑہ ہے لیکن مجھے یہاں بلی گاڑیوں سے کام لینا پڑے گا۔ تو میں آپ کی طرف سے کیا جواب لے جاؤں؟ مدراس کے گورنر کے لیے ہمارا پہلا جواب کافی ہے۔ لیکن اس خط میں گورنر نے یہ لکھا ہے کہ آپ کرنل اسمتھ کو اپنے ارادے سے باخبر کر دیں۔

کرنل اسمتھ کو ہمارا جواب ایک ہفتہ تک پہنچ جائے گا۔ انگریز انفرنے جواب دیا: مجھے یقین ہے کہ اس سے قبل آپ کی خدمت میں ہماری طرف سے ایسے لوگوں کا وفد آئے گا جو آپ کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کر سکیں گے۔

اگر کوئی وفد مرہٹوں کی نیک نیتی کے متعلق مجھے یقین دلا سکا تو مجھے اپنی رائے بدلتے ہوئے خوش محسوس ہوگی۔ بہتر یہی ہوگا کہ وفد میرے پاس آنے کی تکلیف کرنے سے پہلے مرہٹوں کے ساتھ بات چیت کر آئے۔

انگریز انفرنے کہا: یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ملیار میں ہماری کامیابیوں کی اطلاعات سننے کے بعد آپ مرہٹوں کے متعلق سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کریں۔

• عالیجاہ ! وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میں اسی وقت حضور کے ساتھ بات نہ کر سکا تو کل شام تک اس پڑاؤ کا صفایا ہو جائے گا۔

سپہ سالار تھوڑا خاں نے اٹھ کر اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "وہ کوئی پاگل ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں!"

نظام نے کہا: "نہیں شہر ولسے اندر بلاؤ!"
افسر باہر نکل گیا اور چند آنے لے کر معظّم علی کیچڑ اور پانی سے لت پت نظام کے نیچے میں داخل ہوا۔ اس نے اسلام علیکم کہہ کر مجلس پر ایک نظر دوڑائی اور پھر نظام کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "اس بے وقت مداخلت کے لیے میری معذرت قبول فرمائیے لیکن میرے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اشد ضروری تھا۔"

مشیر الملک نے کہا: "حیدر علی نے اپنے ایلچیوں کو معذرت پیش کرنے کے جو طریقے سکھائے ہیں وہ ہمارے لیے بالکل نئے ہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

معظّم علی نے جواب دیا: "حیدر علی کیسے کہی کہ آپ کے آداب کیسے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو ان کی طرف سے یہ پیغام دینے آیا ہوں کہ اگر آپ مرہٹوں کی اعانت کے بھروسے پر یہاں آئے ہیں تو وہ اس جگہ میں حصہ نہیں لیں گے۔ انھوں نے حیدر علی سے صلح کر لی ہے۔"

مشیر الملک نے کہا: "سید علی کی گیدڑ جھبکیاں ہمیں متاثر نہیں کر سکتیں۔ اگر مرہٹوں کی علامت کی خبر درست ہو تو بھی ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

معظّم علی نے جواب دیا: "لیکن یہ بات آپ کو یقیناً متاثر کرے گی کہ اس وقت آپ ہمارے محل محاصرے میں ہیں۔ کل تک آپ کا یہ پڑاؤ چاروں طرف سے ہماری توپوں کی زد میں ہوگا۔ مجھے حیدر علی نے آپ کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لیے نہیں بھیجی ہے، بلکہ میں ان کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں۔ حیدر علی کے اس اقدام کو آپ کمزوری یا بزدلی سے تعبیر نہ کریں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ ہمیں اس ملک

نظام نے ایک سکراہٹ کے ساتھ کرسی سے اٹھ کر مٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا: "ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

انگریز افسر سلام کرنے کے بعد باہر نکل گیا۔
تھوڑی دیر بعد رقص و سرود کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا جب یہ غرض پڑے شہاب

پر تھی اور ایک لوٹڈی میر نظام علی کے جام میں شراب ڈال رہی تھی، نیچے سے باہر سپاہیوں کا شور مچا رہا تھا۔ حاضرین مجلس جواب طلب نہ گاہے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ نظام نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور طلبے اور سارنگی کی صدا میں اچانک خاموش ہو گئیں۔ رقاصہ تذبذب کی حالت میں کھڑی تھیں۔ ایک فوجی افسر نیچے میں داخل ہوا اور اس نے کورنش بجالانے کے بعد کہا: "عالیجاہ ایک آدمی اسی وقت قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے!"

• کون ہے وہ؟ "نظام نے جھنجھلا کر کہا۔

• عالیجاہ وہ کہتا ہے کہ میں حیدر علی کا ایلچی ہوں۔"

مشیر الملک نے کہا: "تم نے اسے پڑاؤ سے باہر کیوں نہیں روکا؟ وہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟"

• جنب وہ سرپٹ آ رہا تھا اور اس نے پہرہ داروں کی کوشش کے باوجود اپنا گھوڑا نہیں روکا۔"

مشیر الملک نے کہا: "جادو اسے قید میں رکھو!"
افسر نے کہا: "لیکن حضور اس نے دھمکی دی ہے۔"

• کیا دھمکی دی ہے اس نے؟
• حضور اگر آپ کا حکم ہو تو اس کی زبان کھینچ لی جائے وہ

نظام نے تھک کر کہا: "بیوقوف! پہلے یہ بتاؤ وہ کہا کیا ہے؟"

انہوں نے اپنے ولیعہد شہزادہ فتح علی ٹیپو کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔
 میر نظام علی خاں نے حیران ہو کر سوال کیا: شہزادہ فتح علی ٹیپو کہاں ہیں؟
 وہ یہاں سے آٹھ کون کے فاصلے پر میری دایہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر آپ
 مصالحت پر آمادہ ہیں تو وہ کل صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے لیکن اگر میری معرکہ
 آپ کو تاثر نہ کر سکیں تو بھی وہ کل یہاں حاضر ہو چکے جائیں۔ میں آپ کو اس وقت
 یہ بھی یہ ثبوت دے سکتا ہوں کہ وہ کب سے آپ کی طرف اور کب کے لئے آئے ہیں۔
 انہیں آج آپ کے سامان رسید کی جو بکریاں انہی تھیں وہ اس وقت میرا ہے قطع
 میں ہیں اور سپاہیوں کا جو دستہ ان کے ساتھ تھا وہ میری قید میں ہے اس پر دستہ کے
 افسر کا نام صولت خان ہے۔ آپ ان کے ذریعہ ان کے لئے بات کر سکتے ہیں۔
 محض پرتھوی دیر کے لئے سنا جھگایا۔ نظام نے کے بعد دیکھے اپنے دروڑوں
 اور افروں کی طرف دیکھا اور عظمیٰ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ہم شہزادہ ٹیپو کے ساتھ
 مصالحت کرنا چاہتے ہیں۔ کے لئے تیار ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب ہم
 حیران سے پوچھ کر قریب گئے تو میری فوج میرا تعاقب نہیں کرے گی؟
 میری شہزادہ ٹیپو کے الفاظ سے بڑی ضمانت اور کیا ہے؟
 میری نصیحتیں سنائی، مطلوب ہوا تو میرا ہے۔ میری توقع تھی کہ میرا
 دل میر نظام علی نے کیا؟ تم شہزادہ ٹیپو کو میری طرف سے یہ پیغام دے سکتے ہو
 کہ ہم مصالحت کی گفتگو کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس پر میرا جواب تھا کہ لا
 کے۔ ہمیں اللہ مرے کیا؟ میری جاہ اگر اجازت ہو تو میں ان کے ساتھ جانا
 چاہتا ہوں۔ اس پر میرا جواب تھا کہ میرا دل میرا ہے۔ میرا دل میرا ہے۔
 ہاں آپ کو اجازت ہے۔
 میری پرتھوی دیر بعد معطر علی اور شمس الامراء گھوڑوں پر سوار ہو کر شہزادہ ٹیپو کی قیام گاہ

انہوں نے اپنے ولیعہد شہزادہ فتح علی ٹیپو کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔
 میر نظام علی خاں نے حیران ہو کر سوال کیا: شہزادہ فتح علی ٹیپو کہاں ہیں؟
 وہ یہاں سے آٹھ کون کے فاصلے پر میری دایہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر آپ
 مصالحت پر آمادہ ہیں تو وہ کل صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے لیکن اگر میری معرکہ
 آپ کو تاثر نہ کر سکیں تو بھی وہ کل یہاں حاضر ہو چکے جائیں۔ میں آپ کو اس وقت
 یہ بھی یہ ثبوت دے سکتا ہوں کہ وہ کب سے آپ کی طرف اور کب کے لئے آئے ہیں۔
 انہیں آج آپ کے سامان رسید کی جو بکریاں انہی تھیں وہ اس وقت میرا ہے قطع
 میں ہیں اور سپاہیوں کا جو دستہ ان کے ساتھ تھا وہ میری قید میں ہے اس پر دستہ کے
 افسر کا نام صولت خان ہے۔ آپ ان کے ذریعہ ان کے لئے بات کر سکتے ہیں۔
 محض پرتھوی دیر کے لئے سنا جھگایا۔ نظام نے کے بعد دیکھے اپنے دروڑوں
 اور افروں کی طرف دیکھا اور عظمیٰ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ہم شہزادہ ٹیپو کے ساتھ
 مصالحت کرنا چاہتے ہیں۔ کے لئے تیار ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب ہم
 حیران سے پوچھ کر قریب گئے تو میری فوج میرا تعاقب نہیں کرے گی؟
 میری شہزادہ ٹیپو کے الفاظ سے بڑی ضمانت اور کیا ہے؟
 میری نصیحتیں سنائی، مطلوب ہوا تو میرا ہے۔ میری توقع تھی کہ میرا
 دل میر نظام علی نے کیا؟ تم شہزادہ ٹیپو کو میری طرف سے یہ پیغام دے سکتے ہو
 کہ ہم مصالحت کی گفتگو کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس پر میرا جواب تھا کہ لا
 کے۔ ہمیں اللہ مرے کیا؟ میری جاہ اگر اجازت ہو تو میں ان کے ساتھ جانا
 چاہتا ہوں۔ اس پر میرا جواب تھا کہ میرا دل میرا ہے۔ میرا دل میرا ہے۔
 ہاں آپ کو اجازت ہے۔
 میری پرتھوی دیر بعد معطر علی اور شمس الامراء گھوڑوں پر سوار ہو کر شہزادہ ٹیپو کی قیام گاہ

کارخ کر رہے تھے۔

اگلے دن نظام کے کیمپ میں شہزادہ فتح علی ٹیپو کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور تیسرے دن سرنگاپٹم میں اس خبر پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ حیدر علی کے ہونہار بیٹے نے اپنی پہلی سیاسی مہم میں ایک شاندار کامیابی حاصل کی ہے اور نظام کی افواج چیتا پٹنا سے واپس حیدرآباد کا رخ کر رہی ہیں۔

مرہٹوں اور نظام کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حیدر علی کی افواج آندھی اور طوفان کی طرح انگریزوں پر ٹوٹ پڑیں۔ شہزادہ حیدر علی علیباد کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا اور انگریز ہر محاذ سے پسپا ہو کر مدراس میں پناہ لے رہے تھے۔ حیدر علی فتوحات کے پرچم لہراتا ہوا مدراس کی طرف بڑھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایوانوں پر زلزلہ طاری ہو چکا تھا۔ انگریز صلیح کے طالب ہوئے۔

تیسرے میسور نے جواب دیا: "صلح کی بات چیت اب مدراس میں ہوگی۔ مدراس سے پانچ میل دور حیدر علی نے صلح کی شرائط پیش کیں اور انگریزوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ انگریز حیدر علی کے رحم و کرم پر تھے۔ اگر وہ چاہتا تو مدراس کے قلعے پر قبضہ کرنا اس کے لیے چند گھنٹوں کی بات تھی۔ مورخ اس سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکے کہ صلح نامہ مدراس کے اصلی محرکات کیا تھے۔ یہ اس فاتح کی بلندوصلگی اور عالی ظرفی تھی جس کے نزدیک گرے ہوئے دشمن پر ہاتھ اٹھانا باعث عار تھا یا حیدر علی کو پیچھے سے نظام اور مرہٹوں کے حملے کا خطرہ تھا! بہر حال جب اس صلح کے عملی نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایک بڑے آدمی کی غلطی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس معاہدے کی شرائط کے نبھانے کے متعلق اس وقت بھی نیک نیت رہتی تھی جب مدراس کا گورنر اس معاہدے پر دستخط کر رہا تھا۔

ایک ماہ بعد مرہٹوں نے ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ دریائے تنگبھرا عبور کر کے میسور

پر حملہ کر دیا۔ عہد نامہ مدراس کی رو سے انگریزوں پر حیدر علی کی مدد ضمنی تھی لیکن انھوں نے مرہٹوں کے خلاف حیدر علی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور اس انکار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز مرہٹوں کی فتح کی امید پر میسور کی بندر بانٹ میں حصہ دار بننا چاہتے تھے۔ حیدر علی قریباً اڑھائی سال مختلف محاذوں پر مرہٹوں کی ٹھڑی دل افواج سے برسرِ پیکار رہا۔ اس عرصہ میں اس کے سرحدی علاقے تباہ ہو چکے تھے۔ مرہٹے شدید نقصانات اٹھانے کے باوجود تازہ دم افواج میدان میں لا رہے تھے۔ جولائی ۱۷۸۲ء میں حیدر علی نے مرہٹوں کی پیش قدمی کو شہرِ انصاریہ صلیح کر لی لیکن انگریز انسروں کی بدعہدی اور مرہٹوں کی جارحیت نے اس پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ میسور کی آزادی کے دشمن اسے زیادہ دیر اکرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔

جنگ سے فارغ ہوتے ہی معظم علی نے اکبر خاں کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ حیدر علی کی فوج میں روہیلکھنڈ کے چند جوان ملازم تھے اور جنگ کے بعد ان میں سے بعض چھٹی پر جا رہے تھے۔ معظم علی نے ایک طویل خط لکھا اور ان میں سے ایک نوجوان کے حوالے کر دیا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:-

"عزیز بھائی! تمہارے آخری خط کا جواب شاید ابھی تک میرے ذمے ہے۔ میں پچھلے چند برس بے مصروف رہا ہوں۔ تاہم مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہارے متعلق اپنے فرائض میں کوتاہی کی ہے لیکن تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ میں تمہیں بھولی گیا ہوں۔ گزشتہ دس سال میں زندگی کو کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب میں تمہاری یاد سے غافل تھا۔ تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ انگریزوں اور اس کے بعد مرہٹوں کے خلاف ہماری جنگ کا ایک دور ختم ہو چکا ہے۔ وہ تاریک بادل جو میسور

خس کے آسمان پر چھلے ہوئے تھے، چھٹ گئے ہیں لیکن میسور میں ہمارے
 راجہ میرے حصے کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ابھی ہمارے
 تخت پر راستے میں کئی اور مراحل باقی ہیں۔ میسور کی آزادی اور لقا اور میسور کے علاوہ چھ
 دیگر مقام ہندوستان کو انگریزوں کے جارجیا علاقے سے بچانے کے لیے رہیں
 گئے۔ ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ سلطان حیدر علی جیسے سیدار مغر انسان کی قیادت
 میں اور شہزادہ فتح علی میسور جیسے اولوالعزم مجاہد کی رفاقت میں لڑنا میرے نزدیک
 ایک بہت بڑی سعادت تھی۔ وہ کس قدر کامیاب تھے کہ ان کی قیادت میں ایک
 بہت بڑے شہر کے بچے نے کھلے دیکھا تھا۔ اب میسور کی فوج کا بہترین جرنیل بن چکا ہے۔
 ہے۔ میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کسی جوان کی ذہانت اور عزم و استقلال
 سے مرعوب نہیں ہوا۔ شہزادہ میسور کے سپاہیانہ جہر، ان کی ملی قابلیت اور
 شہزادہ اور ان کی پاک بازی اور شہزادہ کی قوم کی قسمت سے بڑی بڑی ہے۔
 میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شہزادہ میسور کی رفاقت میں میری زندگی کا ہر سانس
 عبادت ہے۔ سلطان حیدر علی نے جنگ سے فارغ ہونے ہی مجھے سرنگاپم کی فوجی
 تربیت گاہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا تھا اور میرے لیے اس سے بڑا اعلیٰ اور
 کیا ہو سکتا ہے کہ مجھ سے تربیت حاصل کرنے والے جوان کسی دن میسور
 کے اس راجہ عظیم کی قیادت میں مردانگی کے جوہر دکھائیں گے۔ جن کا
 نصیب الفین صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا
 اتحاد ہے۔ یہ فوجی اور سیاسی سبب ہے۔ یہاں تک کہ
 کے قریب چار سال ہونے شیر علی نے مجھے لکھا تھا کہ میں جارجیا
 ہوں۔ اس کے بعد ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آج میں ان

۴۸
 کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔ تمہارے بڑے بھتیجے، صدیق علی خان کو میسور کے
 راجہ کے بڑے بھتیجے جنگی بہادری کا کپتان بننے کا شوق ہے اور میں نے اس
 کی تربیت کرنے کے لیے ابھی اسے ایک فرانسیسی اتالیق مقرر کر دیا ہے۔
 میں یہ مسعود اور اوراکشیر لکھتا رہتا ہوں کہ تم بڑے ہو کر اپنے چچا اکبر خاں
 کے پاس نہیں جائیں گے اور وہاں شہزادہ کر کے، تمہارے سہیل نے چھوٹے
 بھتیجے کا نام مراد علی ہے اور وہ اگلے مہینے دو سال کا بھڑا بچہ کا فرحت
 کی والدہ بچھلے شان و فالت پاگئی تھیں۔ صابر اور دلاور خاں ابھی تک
 بالعمیرہ تھے۔ انہوں نے اور تھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ اگر کبھی فرصت پڑے
 تو بہت خوش ہو جائیں گے۔ اب سرنگاپم آجائے تھیں اور دیکھیں کہ بہت اچھا بہتا ہے
 اور انہوں نے تھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ بچوں کی یہ حالت ہے کہ
 ان سے کوئی میسور کی فوج کے کسی جوان کی بہادری کا ذکر کرتا ہے
 تو وہ بڑے فرحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ تم نے ہمارا چچا اکبر خاں نہیں دیکھا
 معلوم صابر تھیں تمہارے متعلق کتنی فرضی داستانیں سنا چکا ہے کہ وہ
 تھیں اس دور کا بہت بڑا شہزادہ اور بہادر آدمی سمجھے ہیں۔ اگر ممکن
 ہو تو فوراً اپنے کسی کوشش کر دو۔ وہ چھپ چکا ہے۔
 میں ابھی تک اس کا حال نہیں جانتا۔
 تین ماہ بعد معزم علی کو اکبر خاں کی طرف سے جواب موصول ہوا۔
 میں نے اسے جان بوجھ کر خیال تھا کہ اب مجھے بھول چکے ہوں گے۔ کسی
 بہادر آدمی نے سرنگاپم اپنے کارادہ کیا۔ فوجی حالت نے مجھے گھر سے نکلنے
 کی اجازت دینی دینی ہوئی۔ چند برسوں سے شہزادہ میسور کی طرف سے
 ابھی پوچھا ہے۔ میرے بھتیجے شہزادہ تھیں۔ ابھی ہو چکے ہیں۔ بچھلے

سے ہو کر آپ کے پاس آئیں گے :-

بھائی جان ! میں ہر وقت آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں اور نماز کے بعد میری پہلی دعا آپ کے لیے ہوتی ہے۔ میرا بڑا لڑکا داؤد خاں فوسا کی عمر میں گھوڑے سے گر کر فوت ہو گیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی شہباز خاں چھتے سال میں ہے۔ پچھلے سال ہمیں خدا نے ایک لڑکی عطا کی ہے، بلقیس نے اس کا نام تنویر رکھا ہے۔ بلقیس آپ کو اور بھائی جان کو سلام کہتی ہے جہ

آپ کا بھائی اکبر



معظم علی کو سرنگا پٹم کی فوجی تربیت گاہ کے ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ چند مہینے گزرے تھے کہ پونا میں مرہٹوں کے پیشوا مادھو راؤ کے انتقال اور اس کی جانشینی کے دعویداروں کے درمیان خلفشار کی اطلاع ملی۔ حیدر علی کے دل پر مرہٹوں کے دغم ابھی تازہ تھے۔ اس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور میسور کے چھپنے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے چڑھائی کر دی۔ شہزادہ ٹیپو آؤدہ کار انصروں اور سپاہیوں کی ایک فوج لے کر سرائی طرف بڑھا اور اس نے تین ماہ کے اندر اندر سر کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مرہٹے ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے کہ اس نے مدھالڑی اور گرم کنڈ پر لینار کر دی۔ اس عرصہ میں حیدر علی ہوسکوت کا محاصرہ کر چکا تھا۔

ایک دن معظم علی سرسپٹ گھوٹا دوڑا تاہم ہوسکوت کے باہر میسور کی فوج کے کیپ میں داخل ہوا۔ وہ گھوڑے سے اترتے ہی حیدر علی کے خیمے کی طرف بڑھلا جاتا دسٹے کے سالار نے اسے دیکھ کر سلام کرنے کے بعد کہا۔ آپ کا صبح سے انتظار ہو رہا ہے۔ میں ابھی اطلاع دیتا ہوں۔ انصر خیمے کے اندر داخل ہوا اور چند ثانیے بعد اسی

سال انھوں نے ہمارے دو گادیں جلا کر راکھ کر دیئے تھے۔ اس کے بعد میں نے پڑوس کے سرداروں کی مدد سے ان کا تعاقب کیا اور سرحد کے قریب تین سولہیروں کے ایک گروہ کا صفایا کر ڈالا۔ اس کے بعد ہمارے علاقے پر کوئی حملہ نہیں ہوا لیکن روہیکھنڈ کو ہمیشہ مرہٹوں کی یلغار کا خطرہ رہتا ہے۔ حافظ رحمت خاں کی قیادت میں ہم کافی منظم ہو چکے ہیں لیکن ہمارے وسائل محدود ہیں اور ہم تنہا کسی بیرونی طاقت کے ساتھ ملکر نہیں لے سکتے۔ ہم دلی کے حالات سے مایوس ہو چکے ہیں پچھلے دنوں حافظ رحمت خاں نے نواب دزیرا دھ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے مرہٹوں کے حملہ کی صورت میں اودھ کی افواج ہماری مدد کریں گی لیکن کاش ہم نواب دزیرا دھ پر اعتماد کر سکتے۔ میسور کے متعلق سوچتے ہوئے بار بار میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش حیدر علی اور شہزادہ ٹیپو جیسے رہنما شمالی ہندوستان میں پیدا ہوتے۔

شیر علی جج کے بعد مدینہ شریف میں آباد ہو گئے ہیں۔ اپنے ایک ساتھی کی معرفت انھوں نے مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ جج پر جہان سے پہلے وہ اپنا تجارتی کاروبار ختم کر چکے تھے۔ مکان فروخت کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا سرمایہ تھا کہ وہ باقی زندگی بڑے آرام سے گزار سکیں۔

پچھلے سال بلقیس کی والدہ حیدر آباد سے عطیہ کے پاس چلی گئی تھیں۔ چند ماہ بعد ہمیں شیخ فخر الدین کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ دہلی یروانات پاگئی ہیں۔ بلقیس چند دنوں کے لیے اپنی بہن کے پاس جانے سر ہے۔ اگر حالات نے مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت دی تو ہم دونوں

[illegible]

بات ہو۔ سپاہی اسے ملاقات کے کرے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے پہلے یہ
تسلی کر چکے ہیں کہ وہ مسلح نہیں ہے۔
نواب شجاع الدولہ نے کہا۔ اگر یہ دہی عظم علی ہے تو ہم اس سے مزدور ملیں گے
اسے بلاؤ۔

اصف الدولہ کرے سے باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد عظم علی کے ساتھ دوبارہ
کرے میں داخل ہوا۔ عظم علی کے سلام کے جواب میں شجاع الدولہ نے کرسی پر بیٹھے
بیٹھے مصلحتی کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن عظم علی نے اس کے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ نہ
دی۔ اصف الدولہ نے اپنے باپ کے قریب بیٹھے ہوئے منہ کے سامنے خالی کرسیوں
کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "تشریف رکھیے۔" لیکن اس نے کہا۔ "میں بیٹھ کر آپ کا وقت
ضائع نہیں کروں گا۔ مجھے انوس ہے کہ میں نے بے وقت آپ کو تکلیف دی ہے۔ میں
جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے مجھے صرف چند منٹ درکار ہیں۔ میں نے کھنڈ پختہ ہی
ایک دھشت ناک خبر سنی ہے کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر دیکھنڈ
پر چڑھائی کر دی ہے؟"

شجاع الدولہ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر عظم علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اس
سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہ تھی۔
عظم علی نے کہا۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے میں دارن سیٹنگز
کے دربار میں نہیں جاسکتا۔ میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ اودھ کے
مستقبل کے امین ہیں اور ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے اودھ کی رعایا اور اودھ
کی حکومت کے ساتھ دلچسپی ہے۔

شجاع الدولہ نے جواب دیا۔ "تمہیں اودھ کے مستقبل کے متعلق پریشان نہیں
ہونا چاہیے۔ چند دن تک تم یہ سنو گے کہ ہم اودھ کی مملکت میں ایک وسیع علاقہ شامل

کر چکے ہیں۔

عظم علی نے کہا۔ اگر وسیع علاقے سے آپ کی مراد دیکھنڈ ہے تو وہ دن دو
نہیں جب اودھ کا ہر بچہ بوڑھا آپ کے اس فیصلے کی مذمت کرے گا۔ مجھے اندیشہ ہے
کہ دیکھنڈ آپ کی مملکت کا حقہ بننے کی بجائے ان بیٹریوں کی شکار گاہ بن جائے گا جس کے
ہاتھ پلاسی اور گسگری جنگ کے شہیدوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ خدا کے لیے
رو دیکھنڈ کو تباہی سے بچانے کے لیے درجہ شرافت اور انسانیت کے یہ دشمن کسی دن دلی اور
اودھ پر چڑھ دوڑیں گے۔

شجاع الدولہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ حافظ
رحمت خاں نے ہمارے ساتھ بدعہدی کی ہے؟ اس نے ہمارے ساتھ معاہدہ کیا تھا
کہ اگر ہم مرہٹوں کے خلاف اسے مدد دیں گے تو وہ اس کے عوض ہمیں چالیس لاکھ روپے
ادا کرے گا۔ گذشتہ سال جب مرہٹوں نے رو دیکھنڈ پر حملہ کیا تھا تو ہم نے معاہدے کے
مطابق رحمت خاں کی اعانت کے لیے فوج بھیجی تھی لیکن مرہٹوں سے نجات حاصل کرنے
کے بعد وہ ہمیں چالیس لاکھ روپے ادا کرنے کے وعدے سے منحرف ہو گیا ہے۔

عظم علی نے کہا۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ حافظ رحمت خاں نے جنگ کی صورت
میں یہ رقم دینے کا وعدہ کیا تھا اور مرہٹے جنگ کے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ پھر سبھی اگر آپ
یہ سمجھتے ہیں کہ رو دیکھنڈ کو یہ رقم ضرور ادا کرنی چاہیے تو اس کے لیے رو دیکھنڈ پر چڑھنا
کرنا کسی صورت مناسب نہیں۔ خدا کے لیے اپنی افواج کو رو دیکھنڈ اور روہیلوں کو انگریزوں
کے ساتھ پٹنے دیجیے۔ میں اس بات کا ذکر لیتا ہوں کہ آپ کو چالیس لاکھ روپے ادا کر
دیا جائے گا۔ میں حافظ رحمت خاں کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں اور مجھے یقین
ہے کہ وہ چالیس روپے کے بدلے آپ سے لڑائی مول لیتا گوارا نہیں کریں گے۔ اگر مجھے
دبان سے یا کسی اور کو بھی میں یہ وعدہ کر آ ہوں کہ آپ کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی جائے

دوست اور دشمن کون ہیں۔ حیدر علی دخت و بریت کی جس آگ کو سات سمندر دور رکھنا چاہتے ہیں وہ کھٹو کی چار دیواری تک پہنچ چکی ہے۔

اصف الدولہ نے کہا: آخر تم کیا چاہتے ہو؟

معظم علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: اب میں صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا اس قوم کو اس کے اکابر کی گواہیوں اور غلط اندیشیوں کی سزا دے سکے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ معظم علی پر کمر کرے۔ باہر نکل گیا۔

اصف الدولہ نے اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: باباجان اس کے متعلق آپ

کا کیا حکم ہے۔ اگر اجازت ہو تو اسے گرفتار کر لیا جائے؟

شجاع الدولہ نے جواب دیا: نہیں، اسے گرفتار کرنے سے پہلے میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ حیدر علی نے اسے کس مقصد سے یہاں بھیجا تھا اور کھٹو میں اس کے ساتھی اور کون ہیں۔ ہم نے روسیکھند فرمیں روانہ کرتے وقت انتہائی رازداری سے کام لیا تھا لیکن میں حیران ہوں کہ شہر کے لوگوں کو کس نے باخبر کیا ہے۔ تم اس نوجوان پرکڑی غلطی کر رہے ہو۔ معظم علی نے محل سے نکل کر اس سرائے کا رخ کیا جہاں اس کے ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سرائے کے دروازے پر اس کا ایک ساتھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے معظم علی کو دیکھتے ہی سوال کیا: کیسے کچھ کامیابی ہوئی؟

معظم علی نے جواب دیا: ہمیں چند منٹ کے اندر اندر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ معظم علی کے تیر دیکھ کر اس کے ساتھی کو کوئی اور سوال پوچھنے کی جرات نہ ہوئی اور تھوڑی دیر بعد لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر روسیکھند کا رخ کر رہے تھے۔

ایک گھنٹہ بعد اصف الدولہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا: باباجان میں نے جو جاسوس اس کے پیچھے روانہ کیا تھا وہ واپس آ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معظم علی اور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر

کی۔ میں حیدر علی کے پاس جاؤں گا اور اگر میں نے بارہ سال کی رفاقت کے بعد نہیں غلط نہیں سمجھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ دو مسلمان طاقتوں کا اتحاد دم زد کرنے کے لیے چالیس لاکھ روپیہ قربان کرنے کے ذریعہ نہیں کریں گے۔

شجاع الدولہ نے کہا: تم بہت دیر سے اسے جوڑ ہم چالیس لاکھ روپیہ انگریزوں کو ادا کر چکے ہیں۔ ہماری افواج روسیکھند میں داخل ہو چکی ہیں اور دو تین دنوں کے اندر اندر میراں پور کٹرہ پر ہماری فتح کا جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے تیر کان سے نکل چکا ہے اور اس جنگ کی تمام تر ذمہ داری حافظہ محمدت خان پر عائد ہوتی ہے۔

معظم علی نے کہا: اب مجھے معلوم نہیں کہ سلسلے سے مورخ، اس جنگ کی ذمہ داری کتنی پر عائد کریں گے لیکن اگر یہ صبح ہے کہ آج انگریز روسیکھند کو چالیس لاکھ روپیہ ادا کر کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں تو مکمل وہ کھٹو کی آزادی کو ڈیڑھ گھنٹے میں اس کے ہاتھ فروخت کریں گے۔ اگر آپ کو اس ملک کے خلاف انگریزوں کے عزم کے متعلق کوئی غلط فہمی تھی تو وہ پلاسی اور بلکسر کے واقعات کے بعد دور ہو جانی چاہیے تھی۔ روسیکھند پر آپ کی فتح نہیں ہوگی بلکہ امن بیرونی سامراج کی فتح ہوگی خودی ملک اپنا راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔

اصف الدولہ نے اسے کانپ رہا تھا اور نواب شجاع الدولہ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے کہا: یقیناً ان معاملات میں تمہارے مشورہ کی ضرورت نہیں۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم نواب حیدر علی کی طرف سے کسی کوئی ضروری پیغام لے کر آئے ہو۔

معظم علی نے جواب دیا: اب آپ کو حیدر علی کی طرف سے کسی پیغام کی ضرورت نہیں۔ اب آپ کو یہ سمجھنا حیدر علی کے لبس کی بات نہیں کہ اس ملک میں آپ کے

سترھواں باب

ایک شام معظم علی اور اس کے ساتھی گھنا جگل عبور کرنے کے بعد اس وادی میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں اکبر خاں کے قبیلے کی بستیاں آباد تھیں۔ اکبر خاں کے گاون کی طرف جانے والی پگڈنڈی ایک ٹیلے کے اوپر سے گزرتی تھی۔ معظم علی نے ٹیلے پر پہنچ کر اپنے سامنے اچانک وحشت ناک منظر دیکھا اور اپنا گھوڑا روک لیا۔ شام کے دھندلکے میں اکبر خاں کا گاؤں آگ کا ایک بہت بڑا لالہ نظر آتا تھا۔ ایک ٹانیر کے لیے معظم علی کی رگوں میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اکبر خاں کی بستی سے آگے افق پر دو اور بستیاں میں آگ کے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لمحے کے اندر اندر وحشت برتہا اور مظلومیت کے کئی منظر معظم علی کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اس کے ساتھی تہمتی پریشانی کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ معظم علی نے گھٹی ہوتی آواز میں کہا: وہ اکبر خاں کا گاؤں ہے۔ اب وہاں شاید دشمن کے سوا کوئی اور نہ ہو۔ تم یہیں بٹھرو، میں ابھی آتا ہوں!

معلم علی کے ایک ساتھی نجف خاں نے کہا: آپ کہ از کم ایک آدمی کو ضرور ساتھ لے جائیں۔

”بہت اچھا! تم میرے ساتھ آؤ!“

نجف خاں کے ساتھ ٹیلے سے اتر کر کوئی ایک کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد

سے نکل گئے ہیں اور ان کا درخ رو ہیکھنڈ کی طرف تھا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو ان کی بجائے سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کر دیا جائے!“

شجاع الدولہ نے جواب دیا: ”نہیں اب رو ہیکھنڈ پہنچ کر وہ ہمارے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ جگ ایک دو دن کے اندر ختم ہو جائے گی۔ میں صرف لکھنؤ میں ان کی سرگرمیوں سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ مگر یہ آدمی چند دن پہلے آتا تو میں یقیناً اسے گرفتار کر لیتا۔ اب اس کا راستہ رد کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں!“

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library